



جیسے اللہ یار نے قہقہہ لگایا تھا۔  
 ”ہر شام دل کی جگہ ہاتھ رکھ کر تسلی کرایا کرو۔ کیا  
 پتا کسی دن اپنی جگہ سے کھسک جائے اور تم گھیلوں، کوچوں  
 میں ڈھونڈتی پھر دو۔۔۔۔۔ خیر۔۔۔۔۔ ملنا تو وہاں بھی نہیں۔۔۔۔۔ اگر  
 کہیں دھڑک رہا ہوگا تو وہ اللہ یار کا سینہ ہوگا۔ تمہارا دل  
 میرے سینے میں دھڑکے گا راہو۔۔۔۔۔“ ہمیشہ کی طرح اس  
 نے اللہ یار کی یہ بات بھی سنجیدگی سے نہیں لی تھی اور اب جو  
 دل کی جگہ ہاتھ پڑا تو ہوش ٹھکانے آئے تھے۔ سارا وجود

راہو امدادس ہو گئی تھی۔۔۔۔۔ بے چاند سا وجود۔۔۔۔۔  
 بے چاند شب پر نیوٹوں میں دھپک جل اٹھے تھے۔ لاج کی ڈلی  
 آن کی آن میں ہی قدرہاری اتار ہو گئی تھی۔ کھڑکیوں  
 سے بیرون ہوانے کمرے کے اندر جھانگی ماری تھی اور راہو  
 کے لال گلاب چہرے پر نظر پڑتے ہی جھینپ گئی تھی اور وہ  
 تو سیدھا دل پر ہاتھ رکھے کھڑی تھی۔۔۔۔۔ ایسی خاموشی کہ  
 بس۔۔۔۔۔ مانو دل نہ ہوا شمالی سرک ہو گیا جو صدیوں سے  
 راہ گیروں کو تک رہتی تھی۔۔۔۔۔ سماعتوں کے بالکل پاس  
 ماہنامہ پاکیزہ۔ اپریل 2018ء 170



راہو اماوس ہوئی تھی..... بے چاند سا وجود.....  
 بے چاند شب پر نیوں میں دھپک جل اٹھے تھے۔ لاج کی ڈلی  
 آن کی آن میں ہی قندھاری اتار ہوئی تھی۔ کھڑکیوں  
 سے بیرون ہوائے کمرے کے اندر جھانکی ماری تھی اور راہو  
 کے لال گلاب چہرے پر نظر پڑتے ہی بھینپ نکلی تھی اور وہ  
 تو سیدھا دل پر ہاتھ رکھے کھڑی تھی..... ایسی خاموشی کہ  
 بس..... مانو دل نہ ہوا شامی سڑک ہو گیا جو صدیوں سے  
 راہ گیروں کو تک رہی تھی..... سماعتوں کے بالکل پاس  
 جیسے اللہ یار نے قہقہہ لگا یا تھا۔  
 ”ہر شام دل کی جگہ ہاتھ رکھ کر تسلی کر لیا کرو..... کیا  
 پتا کسی دن اپنی جگہ سے کھسک جائے اور تم گلیوں، کوچوں  
 میں ڈھونڈتی پھرو..... خیر..... ملنا تو وہاں بھی نہیں..... اگر  
 کہیں دھڑک رہا ہوگا تو وہ اللہ یار کا سید ہوگا۔ تمہارا دل  
 میرے سینے میں دھڑکے گا راہو.....“ ہمیشہ کی طرح اس  
 نے اللہ یار کی یہ بات بھی سنجیدگی سے نہیں لی تھی اور اب جو  
 دل کی جگہ ہاتھ پڑا تو ہوش ٹھکانے آئے تھے۔ سارا وجود





السلام علیکم

**FAMOUS URDU NOVELS, BOOKS BANK (ویب سائٹ) ہمیں اپنے بلاگز**

**PRIME URDU NOVELS, FREE URDU DIGEST, READING CORNER**

کے لئے ناول رائیٹرز کی ضرورت ہے۔ اگر آپ ہمارے بلاگز پر اپنا ناول، ناولٹ، افسانہ، کالم، آرٹیکل، شاعری پوسٹ کروانا چاہیں تو ہم سے رابطہ کریں۔ اپنی تحریر اردو میں ٹائپ کر کے ہمیں بھیجیں۔  
آپ کی تحریر ایک ہفتے کے اندر پوسٹ کر دی جائے گی۔ مزید تفصیلات کے لئے انباکس میں رابطہ کریں یا ای میل کریں یا ہمارے گروپ اور چیچ پر رابطہ کر سکتے ہیں۔ یا واٹس ایپ پر بھی کانٹیکٹ کر سکتے ہیں۔

Wats app No :- 03335586927

Email address :- [aatish2kx@gmail.com](mailto:aatish2kx@gmail.com)

Facebook ID :- [www.facebook.com/aatish2k11](https://www.facebook.com/aatish2k11)

Facebook Group :- **FAMOUS URDU NOVELS AND DIGEST**

**SEARCH AND REQUEST FOR NOVELS, NOVELS DISCUSSION**



دروازہ بجا تو اماں نے رابو کو آواز دی تھی۔  
 ”رابو دیکھ تو کون آگیا۔“ ادرھ کھن جل جائے گا  
 اگر میں اٹھی تو۔۔۔ وہ پالک کی ٹوکری کیاریوں کے پاس  
 رکھی دروازے کی طرف آئی۔  
 ”کون ہے۔۔۔؟“

”جی میں ہوں اچھوڑا کیا۔۔۔ آپ کی رجسٹری آئی  
 ہے۔“ رابو نے سائن کر کے خط پکڑ لیا تھا اور اماں کی  
 طرف چلی آئی تھی۔  
 ”اماں، اللہ یار کا خط آیا ہے۔“ وہ خاکی لافافہ  
 الٹ پلٹ کر دیکھ رہی تھی۔

”ماں صدقے، چل بیڑھی پر بیٹھ کر پڑھ۔۔۔“  
 ہمیشہ کی طرح وہ پچھلے خود پرستی تھی اور پھر اماں کو پڑھ کر  
 سنائی تھی۔۔۔ اماں بھی اندر رکھ کر کیاریوں کی طرف بقیہ  
 پالک توڑنے آگئی تھیں تاکہ وہ اطمینان سے خط پڑھ  
 لے۔۔۔ رابو نے احتیاط سے لافافہ چاک کیا تھا۔۔۔ اور  
 جیسے ہر طرف غنڈی ہوا تھیں چل پڑی تھیں۔۔۔ وہ جیسے  
 خط کے ساتھ موسم خنکی کر کے بھیجتا تھا۔۔۔ رابو کی نظریں  
 ان موتیوں جیسے لفظوں پر پھسلے گئیں۔  
 ”السلام علیکم۔۔۔!“

اس پر بھی ڈھیروں سلامتی ہو جسے میری سلامتی  
 سے کوئی غرض نہیں۔۔۔ خیر مجھے غریب کی کون پروا کرتا  
 ہے، تم عظیم ہستی ہو یار۔۔۔ جانتا ہوں تمہیں لفظ ”یار“  
 سخت ناپسند ہے۔۔۔ سخت جھنجھلاؤ کی، غصے میں چار پانچ  
 گالیاں بھی دوئی۔۔۔ تم جو بھی کرو اللہ یار حاضر ہے۔۔۔  
 اور سناؤ کہی ہو؟ کہی گزر رہی ہے میرے دل کے  
 ساتھ۔۔۔؟ بڑی قدر ہے تمہیں میرے دل کی جو گھڑیاں  
 کہہ ڈالا تو قوت کافی خطرناک لگتی تھی مگر شکر کہ سب  
 خیریت رہی۔۔۔ چھوٹا سا تو دل ہے میرا جانے تمہاری یہ  
 گھڑیاں سہہ بھی پاتا ہوگا یا نہیں۔۔۔ اری پاگل تم اللہ یار  
 کے دل کی مالک ہو اور نظر رکھتی ہو بکری کے میمنوں  
 پر۔۔۔ اس سے مجھے میری اوقات بتا چل گئی ہے۔۔۔ اور  
 تمہیں کس نے کہا کہ فوجی خرد مارا ہوتے ہیں؟ اپنے  
 دماغ کی فنک کر والو جان من۔۔۔ ہم سے بہتر گانا اور ہم  
 سے بہتر رقص کسی کو نہیں آتا۔۔۔ تم کہاں سمجھو گی۔۔۔؟ اور  
 ہاں میں نے برف کا ایک گھر بنایا تھا تمہارے لیے، وہ  
 ماہنامہ پیا کیوہ۔۔۔ اپریل 2018ء 174

ایک ہفتہ سلامت رہا مگر آٹھویں دن وہ پکھل گیا میں اس  
 دن سورج سے بہت خفا رہا۔ تم ناراض مت ہونا  
 میں تمہارے لیے چار کڑکیوں والا برف کا ایک اور گھر  
 ضرور بناؤں گا۔۔۔ اب تو مسکرا دو۔۔۔ اماں کو کہنا اس بار  
 آؤں گا تو باجرے کی روٹی اور سرسوں کا ساگ کھاؤں گا،  
 قسم سے بڑا دل کرتا ہے رابو۔۔۔ اور تم بھی کوئی چیز بنانا  
 جو تم رسالوں سے ترکیبیں نوٹ کر کے الم فلم بنائی ہو۔  
 اب منہ پھلا کر مت بیٹھ جانا۔۔۔ بڑی پرانی عادت ہے  
 تمہاری، دیکھ لو آج تک یاد رکھے ہوئے ہوں۔۔۔ پچھلا  
 دنوں مرد شہری کے سلسلے میں قریبی پہاڑی علاقے جانا  
 ہوا تو وہاں کی لڑکیاں مجھے دیکھ کر مسکرائی تھیں۔۔۔ جابر کہتا  
 ہے ساری لڑکیوں کو عادت ہوئی ہے خوب صورت لڑکوں  
 کو دیکھ کر مسکرانے کی۔۔۔ مگر مجھے رتی برابر بھی اس بات کا  
 یقین نہیں۔۔۔ کیونکہ مجھے دیکھ کر تم جو بھی  
 نہیں مسکرائیں۔۔۔ جانے اس کی کیا وجہ ہے؟ شاید  
 میں تمہیں خوب صورت نہیں لگتا۔۔۔ اور ہاں ریلوے  
 اسٹیشن پر مجھے لینے ہمیشہ کی طرح اماں کو ہی بھیجتا۔۔۔ تم  
 آئیں تو میرا سامان کا کيسا نہیں گرے گا تمہیں دیکھ کر۔۔۔  
 پورے کا پورا اللہ یار گر پڑے گا۔۔۔ خوشی سے وہیں  
 گھڑے، گھڑے مچاؤں گا۔۔۔ پھلا رابو آئے اور اللہ  
 یار جان نہ دے نامکن۔۔۔ جانتا ہوں لیے خطوط پڑھنا  
 تمہیں غصے میں جھٹا کر دیتا ہے اور میں تو تمہارے غصے  
 سے بہت ڈرتا ہوں۔۔۔ اجازت چاہتا ہوں۔۔۔ اپنا اور  
 اماں کا خیال رکھنا۔۔۔  
 والسلام۔۔۔

(صرف اور صرف تمہارا ”یار“ اللہ یار۔۔۔)  
 جانے کب سے آنگن میں لڑتی بیٹیوں میں صل ہوئی  
 تھی۔۔۔ دیواروں پر پھلتے تو لے کپ کے اڑ چکے تھے۔  
 اماں درانتی سے پالک کاٹ رہی تھیں۔۔۔ اور ”وہ“ تو  
 جیسے اب بھی کسی برف کے گھر میں قیدی جس کی چار  
 کڑکیاں تھیں۔۔۔ اس کا سارا وجود سرد ہوا تھا۔۔۔ وہ  
 بہت عجیب سے انداز میں مسکرائی تھی جس کی کوئی وجہ نہ تھی  
 اور جس کا کوئی نام بھی نہیں تھا۔  
 ”اس بار ریلوے اسٹیشن میں تمہیں لینے آؤں گی  
 اللہ یار۔۔۔ اور دیکھو گی کہ تمہارے سامان کا کيسا کرتا

ہے یا تم۔۔۔“ وہ بڑبڑاتی تھی۔۔۔ اور وہ بڑبڑا ہٹ نیل کٹھن  
 دن چکے تھے۔۔۔ وجوہ سب کچھ تھی۔

☆☆☆

رابو عرف رابو کو وہ شاہی محلہ بھی شاہی نہیں لگا تھا  
 اس کی وجہ یہ تھی کہ اس محلے میں ایسی کوئی بات بھی ہی  
 نہیں جو قلعہ طور ہوئی اسے کبھی پسند نہ آیا تھا وہ محلہ، گلیاں  
 اپنی تنگ تھیں جیسے مسدود دنیاں۔۔۔ لوگ ایک دوسرے  
 سے ٹکراتے پھرتے تھے ہر گھراؤ پر قہقہے ابل پڑتے۔۔۔  
 یعنی خیز مسکراہٹوں کے تبادلے ہوتے۔۔۔ انکوئی ڈپسری  
 کے آگے کوڑا کرکٹ اکٹھا تھا، ٹافوں کے کاغذ سے بچوں  
 کے پوتروں تک۔۔۔ گلیاں پان کی پکیوں سے سرخ تھیں  
 جھجکوا علاقہ کا گمان ہوتا تھا۔۔۔ دیوار سے دیوار ملی تھی  
 لباس، بیوٹرا سیمین بلاناغہ دیکھنے کو ملتی تھی کسی سالن کی  
 کٹوریاں گلیوں میں دھڑلے سے الٹا دی جاتی تھیں۔۔۔  
 بچے سارے شیطانی چیلے تھے، تعلیم کیا خاک حاصل کرتے  
 اسٹر سے ڈنڈے کھا، کھا کر ڈھیت ابن ڈھیت  
 ہو گئے۔۔۔ ماں، باپ نے ہاتھ کا چھالنا بنایا ہوا تھا۔ ہندی  
 لہجے میں اور کارڈوں تو از برتے فرخنا تھے۔۔۔ کھلاڑی  
 ایسے کہ کسی گھر کا آج تک شیشہ سلامت نہ چھوڑا تھا۔  
 انیاں، دادیاں پرانے دتوں کو روٹی تکتی تھیں۔۔۔ زمانے  
 کی قیامت کی چال نے سانس کم کر رکھی تھیں۔۔۔ تار  
 کی گھبوت تھا۔۔۔ مار دھاڑ، شور شرابے والے اس محلے میں  
 بس اذان کے اوقات میں پن ڈراپ سائیکس دیکھنے کو  
 لگتا تھا۔۔۔ سارے کھلونوں کی چایاں کم ہو جاتی تھیں۔۔۔  
 آچمن کا اسٹیریو خاموش ہو جاتا، پاپڑی والے کا باپڑی  
 باندھی۔۔۔ ادرھ اذان تمام ہوئی اور ادھر سارے کھلونوں  
 کو چایاں مل جاتیں۔۔۔ شکیرا سے لے کر نصیبت لال  
 تک سے فیضیاب ہوا جاتا تھا۔۔۔ ملکی بانیک سے لے کر  
 زہما خان تک کے دیوانے تھے۔۔۔ انکشن کے دنوں میں  
 روٹیوں کی بولیاں گنتی تھیں۔۔۔ ووٹ بکتے تھے، تقریریں  
 بوٹیں، چاول یا بھات بانٹا جاتا اور شاہی محلے کی ان دنوں  
 صبح معنوں میں عیش ہوتی تھی۔۔۔ تقریر ختم ہوتی، کھانا  
 کھانڈو دھکم پول ہوتی کہ بس۔۔۔ یہاں زندگی میلے جیسی  
 تھی، جو روز لگتا تھا، بار بار لگتا تھا۔۔۔ بارشیں ہوئیں اور  
 جن کی چھتیں سارے اتارے گاتی تھیں۔۔۔ انگریزوں

دیوار

کے زمانے کی پختہ چھتیں کبھی اگر ٹیک پڑتیں تو سیلاب  
 آ جاتا۔۔۔ گچیاں، بالٹیاں، اگلدان تک بارش کے پانی  
 سے بھر جاتے اور یہ بھرے برتن مرکزی سڑک کے گندے  
 نالے میں خالی کیے جاتے تھے اور وہاں پر یہی برتن بچ  
 سے بجاتے ہوئے نئے، مابے گائے جاتے تھے۔۔۔  
 سارے برساتی میڈنک ایک ساتھ ٹراتے تھے اور یہ۔۔۔  
 بلے ہنگم شور بہت سوں کو ناروا بھی گزرتا تھا مگر اب عادت  
 ہو چکی تھی۔۔۔ میدان میں ٹالپی کے ٹھکنے درختوں پر  
 کپڑے سکھائے جاتے تھے اور محلے کے تین چار ذہین  
 فطین طالب علم جو کہ لکھی کے ہی تھے اسی میدان میں  
 تختیاں سکھاتے اور اونچے، اونچے پہاڑے پڑتے پائے  
 جاتے۔۔۔ بسنت کا تہوار منانا سب کا محبوب مشغلہ تھا۔  
 سب ”دلوں“ کے بچے تھے۔۔۔ بسنت کا میلا بھی میدان  
 میں ہی ہوتا تھا۔۔۔ جہاں رنگ برنگی پتنگوں کے ساتھ،  
 ساتھ بھی، کبھی ہاں بس بھی بھار آنکھوں کے بچ بھی لڑ  
 جاتے تھے۔۔۔ اور ان سب باتوں سے پرے کی بات یہ بھی  
 تھی کہ شاہی محلے کی چھتیں کبھی ناکام نہ ہوتی تھیں۔۔۔  
 یہاں محبت ہونا مشکل تھا مگر محبت پانا بہت ہی آسان۔۔۔  
 وہ خود میں کن رہنے والے لوگ تھے، ان کے پاس محبت  
 کے لیے بھی وقت نہیں تھا اور جن کے پاس وقت تھا وہ  
 کر لیتے تھے اور زندگی جیتے تھے۔۔۔ شاہی محلے کی لڑکیاں  
 لاج کی ڈلیاں تھیں اور لڑکے جدت کو بس ٹی وی اسکریں  
 تک ہی پسند کرتے تھے۔۔۔ چاہے جو بھی تھا اور جیسا بھی تھا  
 شاہی محلے والے سب جانتے تھے کہ وہ سب بہو، بیٹیوں  
 والے تھے۔۔۔ لڑکیاں اب بھی خواتین کے رسالوں  
 میں چھپنے والی رومانوی کہانیاں پڑھ کر دوپٹے  
 واٹوں میں دہکتی تھیں۔۔۔ ایک بات تھی کہ پھر بھی وہ  
 نمکین رحمت والی ساتویں لڑکیاں اس بات سے آگاہ تھیں  
 کہ ان کے لیے کوئی راجکار گھوڑے کی باگیں تھامے  
 نہیں آئے گا۔۔۔ بلا کا ایک تھا ان سب میں۔۔۔ وہ عطر لگا  
 کر اور کالج کی چوڑیاں پہن کر تاحرموں کو توجہ نہیں کرتی  
 تھیں۔۔۔ ان کا ہار سنگار بس ایک ”کاجل“ تھا۔ شاہی  
 محلے والے رکے ہوئے وقت میں زندہ تھے۔۔۔ وقت کا  
 گھڑیاں اسل تھا حرکت ہی نہیں کرتا تھا۔۔۔ وہ بس جی  
 رہے تھے اور جیسے ہی چارے تھے۔۔۔ یہی ان کی زندگی

ماہنامہ پیا کیوہ۔۔۔ اپریل 2018ء 175



تھی اور یہی ان سب کی خوشی تھی..... ایک طرف تو ”وہ“ سب تھے اور دوسری طرف وہ تھی ”رابو“ جو وقت کے گھڑیاں کی سوئی چلا کر بھاگتا تھا تھی..... اسے شاہی محلے سے، چیلے پائے لڑکوں سے، لگی لگائی لڑکیوں سے بے انتہا ”نفرت“ تھی۔

”رابو کو پھر انہی سب سے عقیدت ہونے والی تھی..... جانے کب کیسے اور ہاں..... کیوں؟“

☆☆☆

اسی محلے کے بالکل وسط میں رابو کا غلام گردشوں والا گھر تھا، بقول دادی کے وہ انگریزوں کے زمانے کا تھا..... اس گھر میں رہنے والے لوگوں میں دادی (جنہیں حق سے فرمت نہ تھی) اچھل اور اچھل پچھا اپنی بیویوں اور بچوں سمیت رہائش پزیر تھے۔ ایک اسلم چچا تھے جو کنواری تھے ابھی تک اور انہیں کبوتروں سے فرمت نہ ملتی تھی..... ساجدہ اور ماجدہ بچپن میں جن کے بالوں میں تو چاندی اتر آئی تھی مگر ان کے بیاہ کا دور دور تک کوئی بھی امکان نہیں تھا، دونوں ٹھکانے بالوں میں آج بھی گلابی ربن باندھتی تھیں اور تھڑا کلاس ہندی فلموں کی ہیروئنوں کو بھی مات دیتی دکھائی دیتی تھیں..... دونوں ایک پرائیویٹ اسکول میں استانیات تھیں..... عقیلہ اور فضیلہ چچی دونوں ہمیشہ تھیں، عقیلہ کی دو بیٹیاں فری اور رشی تھیں جبکہ فضیلہ کا ایک ہی بیٹا جاوید عرف جاجی تھا۔ محلے کا وہ واحد لڑکا تھا جو کالج جاتا تھا اور کالج کا بھی اکیلا لڑکا تھا جو اردو اور اسلامیات جیسے مضامین میں بھی شاندار طریقے سے نکل جاتا تھا..... ایک رابو عرف رابو جی جو کہ پڑھائی میں اچھی تھی اور حال ہی میں میٹرک پاس کر کے کالج میں داخل ہوئی تھی..... اپنے باپ کی وفات کے بعد وہ اپنی ماں بانو کے ساتھ یہیں اسی غلام گردشوں والے گھر میں دادی کے ہاں رہتی تھی..... ننھیال میں ننھی ماموں، بوڑھے تاتا کے سوا کوئی نہ تھا۔ بانو سارا دن کلوہ کے تیل کی طرح یہاں کام میں جتی رہتی..... شاہی محلے اور اپنے گھر کے حالات سے تنگ رابو کے لیے گورنمنٹ کالج تو جیسے ایک وٹزر لینڈ تھا..... جہاں حیرتیں ہی حیرتیں تھیں۔ لیے، لیے والا ان، شہنشاہی شہنشاہی راہداریاں، کھلے برآمدے، نیم اور سفیدے کے

خوشبودار بیڑ..... انگریزی گلابوں کی لاتعداد قسمیں، نت نئے فیشن کے ہونے وہ ساری لڑکیاں جو منہ پر ہاتھ رکھے بغیر اونچے قہقہے لگاتی تھیں..... فر، فر انگریزی میں ایک دوسرے کو ڈانٹتی تھیں..... روشنی تھیں، منانی تھیں..... گول کیوں کی ایک پلٹ کو چار لڑکیاں کھاتی تھیں اور کھانا پانی پی کر کاجل سے بھی آنکھیں میچ لیتی تھیں..... لائبریری تو خاموش گہرا تھا جہاں صرف اور صرف کتابوں کو بولنے کی اجازت تھی..... لڑکیاں شاعری کی کتابیں ایٹو کرواکر من پسند غزلیں اپنے رجزوں میں نوٹ کرتی تھیں..... یہاں کی بھاتی دوڑتی زندگی کے رنگوں نے رابو کو حیرت زدہ کر دیا تھا۔ زندگی تو ایسی ہوتی ہے، مطمئن اور پرسکون..... خوشیوں اور شرارتوں بھری..... میں کسی زندگی گزار رہی ہوں..... مجھے خود کو بدلنا ہوگا..... میں ایسے نہیں رہ سکتی، بالکل بھی نہیں۔“ اس نے اپنے آپ سے وعدہ کیا تھا۔

☆☆☆

فری اور رشی چپت پر سبک اپ کٹ کھولے بیٹھی تھیں..... آسان ہلکے، ہلکے بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا مگر دھوپ نہیں، کہیں سے ان کا حصار تو ذکر ضرور جھانک لیتی تھی، وہ میزبیاں چڑھتی اور منڈیر کے پاس آگئی تھی..... فری اسے دیکھ کر عادتاً ہنس کر آتی تھی۔

”کیسا رہا پھر تمہارا کالج کا پہلا دن.....؟“ رشی نے اب مزہ کر اس کی موجودگی کو محسوس کیا تھا۔

”بہت اچھا..... پتا ہے وہ تو کوئی اور ہی دنیا لگتی ہے..... نئے لوگ، نئی باتیں..... وہاں سب کچھ اتنا نیا اور حیران کر دینے والا ہے کہ میں سوچتی ہوں ہم جانے کس دور میں زندہ ہیں.....“ اسلم چچا کے کبوتر چھت پر اوجھل اوجھل رہے تھے۔

”جیسے ان کبوتروں کے پر بندھے ہیں ناں ویسی حالت ہماری ہے..... ہم قید ہیں کسی زندگی بسر کر رہے ہیں..... روایات، حالات اور جانے کیا.....“ وہ قوطی ہورہی تھی، وہ دونوں بھی اٹھ کر اس کے پاس منڈیر تک آئیں۔

”جب بندہ باہر ہی دنیا دیکھتا ہے ناں پھر اپنا آپ واقعی کنویں کا مینڈک لگتا ہے..... ورنہ زندگی تو یہاں بھی گزر رہی ہے رابو.....“ وہ دونوں ایک پارلر سے بیٹھیں

گورس کر رہی تھیں..... رشی کی اپنی ہی فلاسفی ہوتی تھی جہاں ہوا سے وہیں خوش رہتا چاہیے۔

”تم اس زندگی سے خوش ہو؟“ رابو نے رشی سے پوچھا تھا..... جو کبوتر کے جھروں سے اٹھ کر دھماکے نکل رہی تھی اسے اٹھ کر دھماکے سمجھانے میں بڑا مزہ آتا تھا..... فری کو لگا تھا شاید اس نے وہ سوال سنا ہی نہیں تھا ورنہ سوال سن چکی تھی۔

”زندگی کیا ہوتی ہے رابو.....؟ کھانا، پینا، ہنسا، رونا، جاگنا، سونا..... شاید یہی ہوتی ہے میرے نزدیک تو زندگی کی بس یہی تعریف ہے..... اگر تم دونوں مجھے کنویں کا مینڈک کہو گی تو میں ہوں..... میں پیسے ہوں، جیسی ہوں، ٹھیک ہوں.....“ وہ دور آسانوں پر بادل بھینٹے دے دیکھ رہی تھی۔ رابو اس کے ایک دم سامنے آگئی تھی کہ اسے بھینٹنے کا موقع بھی نہ مل سکے..... وہ حرکت تک کر سکے۔

”پھر تو تمہیں جاجی سے شادی پر بھی کوئی اعتراض نہیں ہوگا..... ہے ناں.....؟“ سیدھا دل پر وار ہوا..... رشی سیاہ پڑ گئی۔

”میں جاجی سے کیسے..... میں تو.....“ وہ بات بھری چھوڑتی تھی مگر اس کی آنکھوں کی نمی نے رابو کو لودہ کیا تھا۔

فری نے اٹلے ہوئے آنسوؤں کو سیدھا کیا تھا اور فری نے ہنسی بھی۔

”تم نے اگر دنیا کی سب سے چھوٹی لڑکی دیکھنی ہو رابو..... اپنی رشی کو دیکھ لیتا۔ سارے جہاں کی چھوٹی لڑکیاں.....“ رابو کو وہ کاجل پھیلی آنکھیں نہیں بھول رہی تھیں..... وہ نیچے آئی تھیں تو دیکھا چچا اپنے کبوتر کولسن کھلا رکھے، دادی بائندل میں جھانک رہی تھیں جو ہمیشہ سے لڑی تھا، آخر تنگ کر پرے ڈال دیا..... عقیلہ اور فضیلہ لڑی کھولے بیٹھی تھیں..... جی شورو کرنا جاجی آتا تھا۔

”آئے ہائے مر گیا لوگو.....“ دادی تڑپ گئیں۔

”اے بے گناہے اول فول کہتے ہو، مر میں تمہارے.....“ وہ دادی کے شین پالوں والے تخت پر بڑھے گیا۔

”خیال سے نامراد..... بوڑھی دادی کو گمراہے گا.....“ پتوہ شاپر پاس رکھتا دادی سے لپٹ گیا تھا۔

”شاہر میں کیا ہے؟“ دادی نے منتوں کو سکڑا تھا۔

”علیم ہے دادی.....“ جاجی ہنسا تھا اور یہ بات کہی تھی کہ اس گھر میں علیم ایسی چیز تھی جو کسی کے بھی جی کو نہ بھاتی تھی سوائے رشی کے..... خود جاجی کو بھی نہیں مگر علیم ہمیشہ اس گھر میں رشی کے لیے ہی آتی تھی اور اس راز سے صرف رابو واقف تھی۔

”کاہے پیسے پر ہاد کیے بھلا کوئی کھاتا ہے تو بھی نہیں کھاتا تھا تو اب کیوں.....؟“ دادی کو یقین نہیں آیا تھا..... لگتی سے دوپٹا اتار کر رابو نے بے ساختہ مڑ کر جاجی کے چہرے کو دیکھا تھا اور اس کو سنا تھا جو کہہ رہا تھا۔

”اب علیم مجھے بہت پسند ہے دادی.....“ وہ شاہر اٹھا کر کچن کی طرف آگیا تھا جہاں وہ دراز کھولے جانے کیا ڈھونڈ رہی تھی۔

”سنو رشی.....“ وہ بہت پیار سے بولا تھا۔

”کیا ہے؟“ وہ تنفر سے کہہ رہی تھی..... مسکراتا ہوا اس کے پاس آگیا تھا۔

”میں تمہارے لیے علیم لایا ہوں۔“

”کیوں لائے ہو.....؟“ اسلم کا گلاس رشی نے شور کے ساتھ چٹا تھا وہ دھڑک رہا تھا۔

”تمہیں پسند ہے ناں.....“ وہ شر ہارنگا ہوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

”میں اگر کہوں مجھے چاند بھی پسند ہے تو کیا وہ بھی لا دو گے؟ اب نہیں پسند مجھے علیم.....“ وہ حیران سا اس کے فیسے سے سرخ چہرے کو دیکھتا رہا تھا پھر ذرا آگے بڑھ کر کچن کی کھڑکی جو کچی کی طرف کھلتی تھی اس سے علیم کا شاہر باہر اچھال دیا..... رشی کے قریب آکر وہ تادم سا مسکرایا تھا۔

”اگر..... جاجی کے بس میں ہو تو چاند بھی اٹھا کر رشی کی ہتھیلی پر رکھ دے۔“

☆☆☆

”ہمیشہ کی طرح آئے، کھایا اور ڈکار لے کر کہا ہم معذرت خواہ ہیں آپ کی بچپن کی عمریں زیادہ ہیں..... اماں تم کو بڑا شوق ہے ٹھنکی لوگوں کو بلوانے اور ہر بار ہماری بے عزتی کروانے کا..... اپنا کھاتے ہیں اور اپنا کھاتے ہیں کسی پر بو جھنپتے ہیں ہم.....“ شاہر کے دروازہ بند ہو گیا تھا..... دادی نے سر جھکا یا تھا پھر جاجی کو کپکارا۔



”اے میرا بچہ..... ذرا اسٹول پر چڑھ کر روشندان سے جھانک ذرا ساجدہ نیکیے میں سر دیے پھوٹ، پھوٹ کر نہ رو رہی ہو۔“ اور..... حاجی، وادی کے صحن سے پہلے ہی اپنی ڈیوٹی انجام دینے کو کھینچ گیا تھا..... اس گھر میں یہ نئی بات تو تھی نہیں سب عادی تھے، یہ روز، روز کا ذرا ما تھا..... حاجی نے روشندان سے گردن اندر کر کے دیکھا تھا..... ساجدہ مصلے پر بیٹھی تھی اور دونوں ہاتھ دعا کاٹھے ہوئے تھے..... حاجی نے پلٹ کر حاضرین محفل کو دیکھا۔ ”مصلے پر بیٹھی ہیں، بغیر بتیوں والی خالہ کو بدعائیں دے رہی ہیں جو رشتے سے انکار کر کے گئی ہیں۔“ حاجی ہاتھ جھاڑتا اسٹول سے اتر آیا تھا..... پانو سارا بچا کھچا سامان اندر لے آئی..... رابو نے ابھی تک اٹھائی ہی تھی کہ وادی آ گئیں۔

”ارے کھاؤ، کھاؤ..... بہت خوش ہوگی تم ماں بیٹی..... تم دونوں کی محبت کی وجہ سے میری بچیوں کے رشتے نہیں ہو رہے۔“ وہ بکٹی جھکتی واپس چلی گئی تھیں..... رابو جواب دینے لگی تھی مگر بانو نے ہاتھ پکڑ لیا۔ ”بڑی مٹی ہیں..... پریشان ہیں دل کو کسی نہ کسی طرح تو تسلی دیں گی ناں۔“

”ہر بار وہ ایسا ہی کرتی ہیں۔“ اس کے آنسو گالوں پر لڑھک آئے تھے۔ ”بڑی ہیں بچو گی کہہ سکتی ہیں۔ تم دل برامت کیا کرو۔“ ”اماں ایک تو آپ کی مجھے سمجھ نہیں آتی، جانے کس سارے کی مخلوق ہیں آپ.....“ وہ آنسو پونچھتی ہوئی باہر نکل گئی تھی..... بانو نے گندے برتنوں کے ڈھیر کو دھوئے ہوئے سوچا تھا۔

”تمہیں کیا پتا میری بیٹی..... دو وقت کی روٹی اور سر پر چھت کتنی ضروری ہوتی ہے اور ان دونوں کے لیے بڑا ضبط چاہیے ہوتا ہے..... دل مارنا پڑتا ہے۔“ برتن پانی کے ساتھ، ساتھ بانو کے آنسوؤں تلے بھی بیگم رہے تھے..... رابو ہمیشہ کی طرح چھت پر چلی آئی تھی..... اسلم چچا کیوتروں کے ننھے بچوں کو تھیلیوں پر اٹھا کے ان کا معائنہ کرے تھے وہ ڈرے سے ٹیک لگ کے کھڑی ہو گئی۔

☆☆☆

رختی کا اسٹاپ آ گیا تھا، وہ اتر گئی تھی۔ موسم دلکش ماہنامہ پاکیزہ۔ اپریل 2018ء 178

تھا چھ دن پہلے کی ہوئی بارش نے ابھی تک موسم کو خوشامود بنا رکھا تھا..... چادر سے ڈھکے وجود، مخمور دھلی انگلیوں..... تھا مایک اور سیاہ سر سے سخی اس کی آنکھوں نے حید کو پتھر کر دیا تھا، وہ بت ہو گیا تھا..... وہ لڑکی اس کی بہن عذرا کے ہاں پویشیں کا کوس کر رہی تھی۔

”آہ..... قلو پٹھر..... مصر کے زمانے کی ضرورت نہیں..... آج کے زمانے میں بھی قلو پٹھر اکیں وجود رکھتی ہیں.....“ حیدر نے اپنے آپ کو جیسے مدہوش ہوتا پایا تھا رختی نے اس لڑکے کو اکثر اپنی طرف کھینچتے پایا تھا اور آج وہ پہلی بار اس سے مخاطب بھی ہوا تھا اور آج ہی رختی کو پٹھر کی دلوں کی دنیا کیسے زبردست ہوتی ہے..... وہ رختی پر ہاتھ رکھتے اندر کی طرف بھاگی تھی اور حیدر کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیلی تھی۔

دو پہر کو جب وہ اور رابو درمی پر بیٹھی کھانا کھا رہی تھیں جب رختی نے جھینکتے ہوئے اس سے وہ سوال کیا۔ ”رابو..... قلو پٹھر کون ہے؟“ رابو نے نوالے میں مریج رکھ کر منہ میں ڈالا تھا۔

”قلو پٹھر مصر کی ایک خطرناک حد تک حسین تھی جو مردوں کو اپنے حسن سے گم کر دیتی تھی۔“ رختی کے وجود کا سارا خون اس کے چہرے پر سٹ آیا تھا۔ ”مگر تم کیوں پوچھ رہی ہو؟“ رابو نے انتشار کیا تھا۔

”میں..... میں تو ویسے ہی.....“ شاہی مٹکے کی اس گھٹی پکوں والی چٹیل لڑکی نے اپنے آپ کو واقعی قلو پٹھر سمجھ لیا تھا..... دل کی ڈور حیدر کو تھما دی تھی اور حیدر داغ سے واقف تھا۔

”تم نے واقعی پہلی نظر میں مجھ سے محبت کر لی رختی کی حیرت ہی ختم نہ ہوئی تھی۔

”تمہارے حسن کا حق ہے کہ تم سے محبت کی جا تو پہلی نظر میں ہی کی جائے۔“ وہ مخمور لہجے میں کہتا تھا سفیدے کے تنے سے ٹیک لگائے وہ محبت سے اس شخص، دیکھتی تھی جوابے ”قلو پٹھر“ کہتا تھا۔

”تم مجھ سے کتنی محبت کرتے ہو؟“ ”آسان کے تاروں جتنی۔“

”قلبی باتیں مت کرو حیدر.....“ ”میری باتیں تمہیں قلبی لگتی ہیں؟“ وہ روٹھ

”کہتا تھا..... قلو پٹھر کی جان نکلے لگتی تھی۔“ ”ارے رکو..... مذاق تھا۔“

اور وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر روک لیتا تھا۔ ”بھئی بھولے سے بھی میری محبت کو مذاق نہ کہنا۔“

”خیر..... قلو پٹھر..... مصر کے زمانے کی ضرورت نہیں..... آج کے زمانے میں بھی قلو پٹھر اکیں وجود رکھتی ہیں.....“ حیدر نے اپنے آپ کو جیسے مدہوش ہوتا پایا تھا رختی نے اس لڑکے کو اکثر اپنی طرف کھینچتے پایا تھا اور آج وہ پہلی بار اس سے مخاطب بھی ہوا تھا اور آج ہی رختی کو پٹھر کی دلوں کی دنیا کیسے زبردست ہوتی ہے..... وہ رختی پر ہاتھ رکھتے اندر کی طرف بھاگی تھی اور حیدر کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیلی تھی۔

”تم مجھے چھوڑو تو نہیں دو گے؟“ ”تمہارے سر کی قسم.....“ اور وہ ایمان لے آتی.....

”میں بھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ مجھے بھی محبت کے کی ورنہ تو کہانیوں میں یہ لفظ پڑھا تھا..... تب بڑا لگا تھا۔“ وہ کالج کی چوڑیوں کو کھانے لگتی..... حیدر ہوا جاتا۔

”اب تو بڑا خاص لگتا ہوگا ناں..... تم میرے لیے رکتی ہو؟“ رختی نے چونک کر حیدر کو دیکھا تھا۔

”کیا مطلب.....؟“ ”تمہارے پیار کی شدت جانتا چاہتا ہوں۔“ رختی ایک بل کو بھی نہیں سوچا تھا۔

”جانی کو چھوڑ سکتی ہوں۔“ ”وہ کون ہے.....؟“ حیدر نے اس کے چہرے کو

بڑے غور سے دیکھا تھا۔ ”میرا مکیتر ہے مگر میں اس سے محبت نہیں کرتی۔“

”میرے لیے اعزاز ہے کہ تم مجھ سے محبت کرتی ہو.....“ وہ قہقہے لگتا تھا۔

”کسرتی بدن، گوری رنگت اور کشادہ پیشانی والا دیوتا تھا اور وہ اس کی پچان.....

☆☆☆

”رابو..... دیوتا کون ہوتا ہے؟“ چراغ کی لو

ٹی رابو نے پلٹ کر حیرت سے رختی کو سرور دیکھا۔ ”دیوتا سا جھا ہوتا ہے.....“ رختی پہلی بار گئی تھی۔

”کیا مطلب؟“ ”رابو کی نظریں تھر تھرائی ہوئی لو پر

”اس کی ایک دای نہیں ہوئی اس کا من ایک

دیا

پچان سے نہیں بھرتا۔“ قلو پٹھر نے زمین کو پیروں تلے سے غائب ہوتا پایا تھا..... پچان نے اگلے دن وہی سوال دیوتا کے آگے رکھ دیا تھا..... وہ شاطرانہ انداز میں ہنسا تھا۔

”ہر دیوتا ایک جیسا نہیں ہوتا۔“ اور رختی ایمان لے آئی تھی..... حقیق اور مشکل چھپائے نہیں چھپتے..... یہاں بھی ایسا ہی ہوا تھا..... سفیدے کی خوشبو نے شور مچایا تھا یا پھر رختی کی ہنسی نے؟

”وہ کون ہے رختی؟“ رابو نے پوچھ لیا تھا۔

☆☆☆

اللہ باری زندگی کا ایک ہی مشن تھا ”بڑا آدمی“ بننا جو کہ شاید ہر مہر کی کا ہوتا ہے۔ اللہ یار کے والد کی وفات کے بعد سکینہ اماں نے اسے ماں اور باپ دونوں بن کر

پالا تھا۔ شوہر کے بعد وہ ہی ان کا واحد رشتہ تھا۔ انہیں اس سے بے تحاشا محبت تھی اور اللہ باری بھی اپنی ماں پر جان چھڑکتا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کے بغیر نہیں رہ سکتے تھے..... چھوٹا سادو کروں، غسل خانے اور طویل محن پر مشتمل گھر تھا اور مویشی بازار تھا..... اماں نے ایک بھینس

سے چار کی تھیں اور پانچ مرغیوں کی کتنی کوچیس میں بدلا تھا..... شوہر کی وفات کے بعد ہر طرف سے ایک جملہ

سننے کو ملتا تھا۔ ”سکینہ..... ابھی تیری عمر ہی کیا ہے، دوسرا بیاہ

کر لے۔“ اور انہوں نے کھٹکوں کے بل کپے آگن میں گرتے اللہ یار کو کچھ کر کہا تھا۔

”ایک دوسرے کو میں اور میرا بیٹا اللہ باری کا کافی ہیں۔“ اور وہ دونوں اللہ کے بعد ایک دوسرے کو کافی

تھے۔ آگن میں کیاریاں بنا کر مٹھتی، پالک، آلو اور نمٹاڑ اگے جاتے تھے، توری، کدو کی تیلیں دھریک سے پکائی

ہوتی تھیں۔ بہن مریج کی علیحدہ کیاریاں تھیں۔ ہر شام مرغیوں کی کتنی کرنا اللہ یار کے ذمے ہوتا..... جو بخوبی

نبھاتا تھا..... انڈے بھی وہی جمع کرتا تھا۔ بھینسوں اور بکریوں کے چارے میں بھی مدد کرتا تھا۔ بستی کے اسکول

کا سب سے لائق لڑکا تھا..... سلیٹ اور تختی پر اس کے لفظ سچے موتیوں کی طرح نکھرے ہوتے..... ہر جماعت میں وہ اول آتا..... وہ سب سے الگ تھلگ سا رہتا تھا اور

ماہنامہ پاکیزہ۔ اپریل 2018ء 179



اماں کی بار بار سے ٹوٹی تھیں۔

”کوئی تھی ساسی بنا..... اکیلا پھرتا رہتا ہے۔“

لکی پیتا وہ فس دیتا تھا۔

”خیر سے علاوہ کسی سے دوستی نہیں کرنی۔“

”جھلا.....“ میٹرک میں اس نے پوزیشن لی تھی

اور سیکٹ نے اسے پاس بٹھا کر کہا تھا۔

”میں چاہتی ہوں تو بڑا آدمی بنے اللہ یار..... یہ

میری آخری خواہش سمجھ لے پتر..... میں چاہتی ہوں

آگے کی پڑھائی کے لیے تو شہر چلا جا..... وہاں میری اماں

کی سہیلی ریتی ہے کلثوم اسی کے ہاں رہنا.....“ اور اللہ یار

کی سانس رک گئی تھی۔

”مگر اماں تجھے چھوڑ کر.....“ اماں نے اس کی

پیشانی چوم لی تھی۔

”اللہ ہے میرے ساتھ..... اور تیری ماں تو بڑی

بہادر ہے..... اور تو پھر چھٹی پر گھر بھی تو آیا کرے گا

ناں.....“ اللہ یار کی ماں تھیں وہ سب سمجھتی تھیں، وہ

آنکھوں میں موٹے، موٹے آنسو لیے انہیں دیکھ رہا تھا۔

اماں نے خود سے پلٹا لیا تھا۔

”اللہ یار تو میری ایک بات مان جا اور میری لاج رکھ

لے، میں تیری سوا تیں مانوں گی۔“ وہ روتا، روتا فس پڑا تھا۔

”یاد رکھنا یہ بات..... کہیں بھول مت جانا.....“ وہ

نفی میں سر ہلا گئی تھیں۔ اور آج وہ ریلوے اسٹیشن پر بیٹھا

گاڑی کا انتظار کر رہا تھا۔ ریل کی پٹریاں دھوپ میں

چمک رہی تھیں۔ نفی اپنی ٹوپیاں سر پر جمائے چہل قدمی

کر رہے تھے۔ ان کی چال میں عجب سی بے نیازی

تھی۔ اللہ یار نے بڑا سا صندوق اٹھا رکھا تھا جس میں اس

کا ضرورت کا سامان اور گاؤں کی سوغات تھیں جو شہر

والوں کو دینی تھیں۔ ”اماں نے جانے کیوں اتنی دیر بھیج

دیا ہے جانے وہ کیسے لوگ ہوں گے۔ جانے وہاں میرا

دل لگے گا بھی یا نہیں..... اماں تو موم تھیں جانے اب

کیوں دل پتھر کر لیا۔“ سوچ کے دھماکے اٹھتے چلے

جا رہے تھے..... بھیجی گاڑی کی سیٹی اور چٹکتائیں مارتے

انجن کی آواز سنائی دی تھی اور وہ اٹھ کھڑا ہوا تھا..... جہاں

وہ جا رہا تھا وہاں بچپن میں دو تین بار جا چکا تھا.....

یادداشت کے خانے سے وہ سب مٹ چکا تھا..... کھڑکی

ماہنامہ پاکیزہ۔ اپریل 2018ء۔ 180

کے ساتھ والی نشست پر وہ سٹ کر بیٹھ گیا تھا..... ٹھنڈی

نے اس کے سلیقے سے جیسے ہال بکھر کے رکھ دیے تھے۔

☆☆☆

نیم کے درخت سے ٹپک لگائے کھڑی رختی کی

جان راہو نے لال لی تھی.....

”میں پوچھ رہی ہوں کون ہے وہ؟“ رختی.....

تھوک لگاتا تھا۔

”ک..... کون..... کس کی بات کر رہی ہو تم؟“

چھڑی سے پکڑی زمین کریدتی راجہ نے طنز یہ نظروں.....

اسے دیکھا تھا۔

”بات بے بات توجہ نہیں چھوٹا کرتے..... یہ تم

ہوتا ہے جب کوئی دوسرا دل میں شرارت کھول جاتا ہے۔“

”تمہیں وہم ہوا ہے۔“

”کنواری لڑکیاں ہی کنواریوں کے راز پکڑتی

ہیں۔ میں نے تمہاری چوری پکڑ لی ہے..... تمہیں تو قلعہ

کہانیاں پسند نہیں تھے ناں..... اب کیوں ہر بار ہم.....

روبانوی کہانیوں کا پوچھتی ہو۔“ رختی نے آنکھوں.....

کا جل کو پھیلتا محسوس کیا تھا، وہ ہر بار کی طرح اس ہار بھی

راہو سے ہار گئی تھی۔

”وہ بہت خوب صورت ہے راہو.....“ راہو نے

اسی نفی ہوئی شام کو کرتے دیکھ لیا تھا۔

”جاہلی سے بھی؟“

”ہاں جاہلی سے بھی..... دنیا کے سب مردوں.....

بھی..... قلو پھر کہتا ہے مجھے.....“ رختی کی آواز سرکائی

میں ڈھل گئی تھی۔

”جب مرد کی عورت کو قلو پھر کہتا ہے تو کیا واقعی

وہ اس سے محبت کر رہا ہوتا ہے، رختی.....؟“ راجہ.....

سوال نے رختی کا وجود مفلوج کر دیا تھا۔

”مگر وہ مجھ سے واقعی محبت کرتا ہے..... مجھے اس

کا یقین ہے راجہ..... میں جی کہتی ہوں۔“ راجہ.....

چھڑی دور چمک دی تھی اور ہاتھ جھاڑی اس کی ناک کی

سیدھ میں آن کھڑی ہوئی تھی۔

”مجھے بھی ایک بات کا پکا یقین ہے اور جی کہتی

ہوں رختی، جاہلی سے بڑھ کر کوئی محبت نہیں کر سکتا

..... جان دے، دے گا تمہارے لیے وہ۔“

www.urdumag.com

دریا

بھاپ نے انہیں سب بھلا دیا..... ابھی تین ہی بجے تھے

اور آسان کو گھر سے کالے بادلوں نے ڈھانپ لیا تھا۔

نیم کی کچھ چھوٹوں پر بارش نے ساز بکھرے

تھے..... نیم کی شائیں ٹوٹ رہی تھیں..... بارش نے جل

تھل کر دیا تھا..... اللہ یار نے ریلوے اسٹیشن کی عمارت پر

برقی بارش کو تشویش سے دیکھا تھا اور پھر کلائی پر بندھی

گھڑی میں وقت دیکھا تھا..... شام ہو چکی تھی، چھ بج چکے

تھے۔ اسٹیشن کے زرد بلب جل اٹھے تھے..... لوگ موسم

سے بے پروا ہو کر اپنی مستی میں مگن تھے۔ جب وہ بالکل

مایوس ہو چکا تھا اور پریشانی کی آخری حدود پر تھا..... بھی

اس نے ایک ٹھٹھری ہوئی آواز سنی تھی۔

”السلام علیکم.....“ اللہ یار نے سرائی کر دیکھا تھا

دبلا پتلا سا، ٹھنڈے سے اکڑا ہوا جاہلی مسکرانے کی ناکام

کوششوں میں تھا۔

”وعلیکم السلام.....“ وہ دونوں گلے گلے گئے تھے۔

”مگر کیسا رہا؟“ جانے یہ سوال آج تک پرانا

کیوں نہیں ہوسکا۔ اللہ یار اس کے ساتھ، ساتھ ساتھ گئے کی

طرف جا رہا تھا۔

”اچھا رہا.....“ وہ دونوں تانگے پر بیٹھ گئے

تھے..... کبھی سرک پرتانگے کی آواز عجب سی سنائی دے

رہی تھی۔ سارا شہر اندھیرے کی لپیٹ میں تھا شاید کبلی

کے فیڈ رزٹ پر کر گئے تھے..... سڑک کنارے کھڑے

درختوں کی ٹھٹھ کی چھاؤں سے رات سے خوف آ رہا

تھا..... کچھ دیر میں وہ شامی محلے کی گلیوں میں سے

گزر رہے تھے..... تنگ و تاریک گلیوں سے گزرتا جان

جو کسم میں ڈالے جیسا تھا..... اللہ یار سنبھل کر

قدم رکھ رہا تھا اور اس کے سامنے جاہلی تین بار اندھیرے

منہ گر چکا تھا۔

”اللہ یار..... سنبھل کے قدم رکھنا.....“ سنبھل کر

قدم رکھنے والا اللہ یار بھی ایک بار گر چکا تھا اس نے بے مشکل

اپنی لمبی چھپائی تھی وہ تو شکر کہ اندھیرے میں جاہلی

نہیں دیکھ پا رہا تھا ورنہ نفی شرمندگی ہوتی..... آخر گلیوں کی

پل صراط عبور کر کے دھمکے دروازے پر پہنچے تھے.....

اسے پلروں والے برآمدے میں کھڑا کر کے جاہلی اندر

کہیں بھاگ گیا تھا۔ سرد ہوا میں جسم چھو رہی تھیں.....

ماہنامہ پاکیزہ۔ اپریل 2018ء۔ 181

”اور حیدر میرے لیے کسی کی بھی جان لے، لے

.....“ راجہ نے نفی کو روک دیا تھا۔

”جان دینے اور جان لینے میں بڑا فرق ہوتا ہے

رہی..... جس دن اس فرق کو سمجھو گی تو مرثو کی جاہلی

.....“ راجہ آگے بڑھ آئی تھی۔ گھر کے عقبی حصے کا منظر تھا

ماں بوڑھا حاتم کا بیٹا تھا..... رختی نے درختی سے راجہ کا

ہم پکڑ کر روکا تھا۔

”تو تم کرنا تو جاہلی سے شادی.....“ راجہ حیرت

سے مڑی تھی سینے پر انگلی رکھی۔

”میں کرلوں؟ ضرور کر لیتی اگر مجھے جاہلی سے

محبت ہوتی یا پھر جاہلی کو مجھ سے محبت ہوتی۔“ ہاتھ چھڑاتی

آگے بڑھ گئی تھی اور رختی وہیں کی وہیں کھڑی رہ گئی

..... ہمیشہ کی طرح دادی نے دوپہر کے کھانے پر

ایمان سے ہم چھوڑا تھا۔

”کیونکہ کا پینا آ رہا ہے..... کالج میں داخلہ لے گا

.....“ دادی نے سب کو دیکھا تھا سارے

ایمان سے کھانا کھانے میں مگن تھے۔

”اور وہ ہمیں رہے گا..... پہلے اچھورا بوکڑا تھا۔

”آف..... اس چڑیا گھر میں ایک اور نئے جانور کی

.....“ ساروں کی بے نیازی اڑ چھو ہو گئی تھی۔

”مگر اماں ایسے کیسے..... جوان لڑکیاں ہیں

.....“ دادی نے غصے سے چنگیر پر سے چنگی کی تھی۔

”اس..... فیئر لڑکا..... بیٹی سمجھ لوں گی جو دوبارہ کہا

..... اپنی سینگ کا بچہ ہے۔ ہر سال نئی گاؤں کی سوغات

لگاتے تو غیرت لگتیں اب کا ہے، نیم لڑکا ہے بھی..... جیسا

.....“ اسلم چچانے آج کو بڑھ بھونا تھا وہ اس سب

..... بے نیازی دیکھنے میں لگے تھے۔

”اور وہ رہے گا کہاں.....؟“ اصل سوال اجمل کی

.....“ سے آیا تھا۔

”جاہلی کے کمرے میں رہے گا اور کہاں رہنا.....

.....“ دادی کا فیصلہ ہمیشہ کی

..... حرف آخر ثابت ہوا تھا..... حاضرین محفل کی بولتی

.....“ دادی نے جاہلی کو مخاطب کیا تھا۔

”شام چھ بجے اسے اسٹیشن سے لے آنا.....“

..... نے سر ہلا دیا تھا..... چائے کے کپوں سے اشقی

www.urdumag.com



اندھیرے پر آمد کے آخرے سرے پر روشنی نفلے کی طرح ابھرتی ہوئی دھیرے دھیرے پاس آ رہی تھی۔ چلوں کی جھار مٹی کے دیے پر جھکی تھی۔ کیلی ٹیس پیشانی پر بھری ہوئی تھیں۔ وہ پوری طرح دیے کی لو کی طرف متوجہ تھی، دونوں تھیلیوں کے حصار میں وہ اس روشنی کے نفلے کی حفاظت پر مامور دربان کا کردار ادا کر رہی تھی۔ وہ بالکل اس کے پاس آن کھڑی ہوئی تھی۔ اللہ یار نے دل کو پہلو سے کھسکا پایا تھا۔

”کون ہوتا؟“ روشنی کے نفلے سے نظریں ہٹ کر اللہ یار کی طرف اٹھی تھیں اور اس نے سرسراے لہجے میں پوچھا تھا۔

”اللہ یار۔“ وہ دل سے مسکرایا تھا۔

☆☆☆

وہ جاہلی کے بستر میں دیک کر بڑھا تھا جب بانو کھانا لے کر اندر آئی۔ دیوار کے کیل پر لگی لائٹیں کی روشنی پورے کمرے میں بکھیلی ہوئی تھی۔

”تمہاری اماں کیسی تھیں؟“

”جی، وہ ابھی تھیں۔“ بانو نے غور سے اسے دیکھا تھا وہ اپنے باپ کی شکل پر گیا تھا۔

”تمہیں شاید یاد نہ ہو مگر بچپن میں تم یہاں تین، چار بار آ چکے ہو۔“

”بچی تائی۔۔۔؟“ جاہلی نے بانو کو دیکھا تھا۔

”ہاں چھوٹا سا تھا تو سیکھنے کے ساتھ آتا تھا۔“ اللہ یار رغبت سے اب کھانا کھا رہا تھا وہ کب سے بھوکا تھا۔

جب پیٹ بھر چکا تو اس نے بانو کو شرمندگی سے دیکھا تھا۔

”میں کچھ زیادہ کھا گیا کھانا۔ کھانا بہت ڈالنے دار تھا۔“ بانو نے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا تھا۔

”کھانا کھانے کے لیے ہی تو ہوتا ہے۔ آئندہ کسی بھی چیز کی ضرورت نہ ہو تو بے جھجک کہہ دینا۔“ اللہ یار کو وہ بہت اچھی اور اپنی، اپنی ہی تھی۔ صبح کو ناشتے کی میز پر وہ باقی سب سے متعارف ہوا تھا۔ اور تقریباً سبھی اسے پسند آتے تھے۔ دادی اس سے بہت محبت اور شفقت سے پیش آتی تھیں۔

”پتر۔۔۔ اسے اپنا ہی گھر سمجھنا۔۔۔ ہم سب تمہارے اپنے ہیں۔ آج ہی جاہلی کے ساتھ کالج میں

داخلہ کروانا۔۔۔ وہ اور جاہلی کالج داخلہ کروانے آئے تھے۔ اللہ یار کو وہ کالج بہت پسند آتا تھا۔ داخلہ ہو گیا وہ بہت خوش ہوا تھا۔ واپسی پر وہ سڑک پر چہل قدمی کرتے آئے تھے جاہلی نے راستے کے ہر پتھر کو جوتے کی نوک سے اڑایا تھا۔

”تم نے پڑھائی کیوں چھوڑ دی۔۔۔؟“ جاہلی گلی سے ہنسا تھا۔

”بس یار پڑھائی تو ڈھائی میرے بس کی بات نہیں ہے۔ ایسے ہی ٹھیک ہوں۔“ اللہ یار نے حیرت اس کا کھنڈر اپن دیکھا تھا۔

”مستقبل کے لیے کیا سوچا ہے؟“

”بھئی وقت آنے پر سوچیں گے۔ اپانے کا رہا، کرو یا تو۔۔۔“ وہ گھر آئے تو ساجدہ اور ماجدہ دفتر کو بلے بیٹھی تھیں۔ ہر کسی کو پیسے دیے جا رہے تھے بعد میں عقہ کھلا کہ تنخواہ ملنے ہی وہ گھر کے اخراجات کو جیب خرچ لے لیں تھیں۔ ماجدہ نے کچھ ٹوٹ اللہ یار کو تھما دیے تھے۔

”رکھ لو۔ تمہارے ہیں۔“

”مگر میرے پاس ہیں۔“ وہ ہنسیا تھا۔

”تمہاری اماں کے بڑے احسان ہیں ہم ہاں بگڑے۔“ انہیں اللہ یار اچھا لگا تھا۔ بانو کا بیٹا اچھوکر آتا تھا۔ اللہ یار اپنے ساتھ دیکھی تھی، انڈے اور حلوے لایا تھا۔ جس کے لیے سب مشکور ہو رہے تھے۔

اسلم چچا کے کبوتروں کو ذکام ہو گیا تھا۔ وہ انہیں اسپرں گھول، گھول کر پلا رہے تھے۔ دادی حقہ تھانے ٹیلی تھیں۔ اجمل اور اکمل ایک ٹھیکیدار کے ملازم تھے، 11 شام کو کہیں جاکے لوٹتے تھے۔ جھجے کے روز دوپہر آجاتے تھے۔ وہ چیت پر آگیا تھا۔ یقیناً اس پورے محلے میں صرف یہی گھر کچھ کام کا تھا۔ اور جس چوہا رہ بھی سرخ اینٹوں والا تھا جن کا رنگ کب کا زہا تھا۔ فری ٹیڈر تھا۔ اسے اب بھویں درست کر رہی تھی اسے دیکھا تو رک گئی۔ مسکراہٹ بھی پیش کر ڈالی تھی۔

”میں فری ہوں۔“ اللہ یار بھی جوا مسکرایا تھا

روشنی منڈ پر کے پاس کھڑی تھی۔

”میں رشتہ ہوں۔ سب رشتی کہتے ہیں موسم صاف تھا۔ سمو سے تلنے کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی

آسمان نیلا سر پر تکا کھڑا تھا۔ اللہ یار نے چوہا رہے کی

نڈ پر سے نیچے جھانکا تھا۔ آگن میں اٹھی پر راجہ کپڑے

”ان کا کیا نام ہے؟“ اللہ یار نے دور نیچے صحن کی

طرف اشارہ کیا تھا۔

”راہو۔“ رشتی نے منڈ پر سے نیچے کی طرف دیکھا اور مسکرائی۔

☆☆☆

”میں راہو ہوں۔“ راجہ نے مسکراتے ہوئے اپنے سامنے کھڑی مقدس سے ہاتھ ملا تھا۔ وہ ان کی دوستی کا پہلا دن تھا۔ راہو نے کالج میں پہلی کوئی دوست بنائی تھی اور یہی حال مقدس کا بھی تھا۔ بقول اس کے اسے برداشت کرنا ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔ راہو کو مقدس پر رشک آتا تھا وہ ول آف مکی سے تعلق رکھتی تھی۔ ہمیشہ ٹاپ رہتی، ٹھنڈے ہال اور شہد مکی رنگت کے ساتھ جب وہ گردن پیچھے کر کے ہنسی تھی تو کوئی اہمراہتی تھی۔ راہو کو اس کی خوب صورت ہنسی سے مانوس تھا۔ راہو کو اس کی اکثر باتیں حیران پریشان کر دیتی تھیں۔ وہ ڈیزائنرز کی باتیں کرتی۔

”یار تم کس جہان میں رہتی ہو؟“ اس کی لاطلی پر مقدس ہنسی پٹی جاتی۔ اس کے سروانقری تھبتے نے راہو کو بے حد شرمندہ کیا تھا۔

”یقیناً نہیں آتا یار۔۔۔ تم اب بھی تانگے پر کالج آتی ہو، بالوں کو سرسوں کے تیل سے شراہور کرتی ہو۔

”کیسا ماحول ہے تمہارے ہاں کا۔۔۔“

”ہاں بس ایسا ہی ہے سب کچھ۔“ راہو نے گپیں کا کھڑا منہ میں رکھا تھا۔

”تمہارے ہاں کی لڑکیاں اب بھی رضیہ بٹ کے ٹاؤل پر ہوتی ہیں؟“ راہو کے تصور میں ماجدہ پچھو آتی تھیں۔

”میری پچھو ہوتی ہیں۔“ مقدس نے سر جھکا تھا۔

”جین آئسن اورا کا تھا کرشی پڑھنا چاہیے۔“ راہو کھڑی سانس لے کر رہ گئی تھی۔ وہ دونوں عجیب طریقے سے ایک دوسرے کے قریب آتی تھیں دونوں کے مزاج میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ مگر پھر بھی وہ دونوں اچھی

بھیلیاں تھیں۔ دونوں کو ایک دوسرے کو برداشت کرنا

آتا تھا۔ مقدس ڈرائیور کے ساتھ گاڑی پر آتی تھی مگر کچھ دنوں سے اس کا کزن آ رہا تھا۔ وہ دونوں سڑک کنارے کھڑی تھیں راہو تانگے کی منتظر تھی۔ بھیجی نزدیک ہی گاڑی کے تازہ چرچرائے تھے۔ مقدس گاڑی میں بیٹھ چکی تھی۔ فردین علی نے شیشہ نیچے کر کے اس نقاب پوش لڑکی کو دیکھی سے دیکھا تھا۔

”آپ نہیں چلیں گی ہمارے ساتھ۔۔۔؟“ راہو کی فائل پر جی انگلیاں کپکپا گئی تھیں۔ آنکھوں میں۔۔۔ بے تحاشا حیرت تھی۔ وہ جان لیوا مسکراہٹ کے ساتھ گاڑی آگے بڑھانے لگا تھا۔

”تمہارے کزن کو ذرا بھی تیز نہیں۔“ اگلے دن سائنس بلاک کی سیڑھیوں پر بیٹھے ہوئے راہو نے اپنا قصہ مقدس پر اتارنا تھا۔ مقدس سر نیچے کی ہنسی رہی تھی۔

”تم ہنس رہی ہو؟“ راہو کیسے شاک ساگتا تھا۔ کچھ لڑکیوں گردیں میں چہل قدمی کر رہی تھیں۔ کچھ امرودوں پر نشانے باندھ رہی تھیں۔ دو چار بڑھا کو قسم کی لڑکیاں ٹوٹس کا طوقان اپنے گرد بٹھرائے بیٹھی تھیں۔

”ادھر تم فردین کی برائیاں کر رہی ہو اور ادھر وہ تمہاری تعریفیں کر کرے میرا سر کھایا ہے۔“ راہو کا دل عجب بے پردہ کرنا تھا۔

”ہوئے فردین خان کہیں کا۔۔۔“

”پلیز نہیں۔۔۔ بریڈ پٹ کا زمانہ ہے۔“ مقدس نے ہاتھ جوڑے تھے۔ راہو جاننے کے باوجود بھی ذہن سے وہ دوچھتی آنکھیں نہیں نکال سکی تھی۔ اب وہ روز مقدس کو لینے آ رہا تھا۔ دلچسپی سے اسے دیکھتے وہ اس کی طرف ایک مسکراہٹ ضرور اچھال دیتا تھا۔ اور وہ ایک مسکراہٹ راہو کو جانے کیوں سارا دن سرشار رکھتی۔ ڈیزائنرز ٹھٹ۔۔۔ پاس کی مہک اور جیل سے سنورے ہال وہ بی وی اسکرین پر نظر آتے ہیہر وجہا تھا۔ راہو کو ایک دم سے اپنے ماحول سے نفرت ہوئی تھی۔ ایک دن کسی وجہ سے جلدی چھٹی ہوئی تو مقدس نے اس کا بازو پکڑ لیا تھا۔

”پلیز چلو ناں۔۔۔ بس کافی نی کر واپس آ جا جس گے۔۔۔ ابھی تمہارا تانگا بھی دیر سے آئے گا۔“ وہ ہنسیا جاتی تھی۔

”نہیں مقدس۔۔۔ ایسے کیسے کسی نے دیکھ لیا

آتا تھا۔۔۔ مقدس ڈرائیور کے ساتھ گاڑی پر آتی تھی مگر کچھ دنوں سے اسے لینے اس کا کزن آ رہا تھا۔ وہ

دونوں سڑک کنارے کھڑی تھیں راہو تانگے کی منتظر تھی۔ بھیجی نزدیک ہی گاڑی کے تازہ چرچرائے تھے۔

مقدس گاڑی میں بیٹھ چکی تھی۔ فردین علی نے شیشہ نیچے کر کے اس نقاب پوش لڑکی کو دیکھی سے دیکھا تھا۔

”آپ نہیں چلیں گی ہمارے ساتھ۔۔۔؟“ راہو کی فائل پر جی انگلیاں کپکپا گئی تھیں۔ آنکھوں میں۔۔۔ بے تحاشا حیرت تھی۔ وہ جان لیوا مسکراہٹ کے ساتھ گاڑی آگے بڑھانے لگا تھا۔

”تمہارے کزن کو ذرا بھی تیز نہیں۔“ اگلے دن سائنس بلاک کی سیڑھیوں پر بیٹھے ہوئے راہو نے اپنا قصہ مقدس پر اتارنا تھا۔ مقدس سر نیچے کی ہنسی رہی تھی۔

”تم ہنس رہی ہو؟“ راہو کیسے شاک ساگتا تھا۔ کچھ لڑکیوں گردیں میں چہل قدمی کر رہی تھیں۔ کچھ

امرودوں پر نشانے باندھ رہی تھیں۔ دو چار بڑھا کو قسم کی لڑکیاں ٹوٹس کا طوقان اپنے گرد بٹھرائے بیٹھی تھیں۔

”ادھر تم فردین کی برائیاں کر رہی ہو اور ادھر وہ تمہاری تعریفیں کر کرے میرا سر کھایا ہے۔“ راہو کا دل عجب بے پردہ کرنا تھا۔

”ہوئے فردین خان کہیں کا۔۔۔“

”پلیز نہیں۔۔۔ بریڈ پٹ کا زمانہ ہے۔“ مقدس نے ہاتھ جوڑے تھے۔ راہو جاننے کے باوجود بھی ذہن سے وہ دوچھتی آنکھیں نہیں نکال سکی تھی۔ اب وہ روز

مقدس کو لینے آ رہا تھا۔ دلچسپی سے اسے دیکھتے وہ اس کی طرف ایک مسکراہٹ ضرور اچھال دیتا تھا۔ اور وہ ایک مسکراہٹ راہو کو جانے کیوں سارا دن سرشار رکھتی۔

ڈیزائنرز ٹھٹ۔۔۔ پاس کی مہک اور جیل سے سنورے ہال وہ بی وی اسکرین پر نظر آتے ہیہر وجہا تھا۔ راہو کو ایک دم سے اپنے ماحول سے نفرت ہوئی تھی۔ ایک دن کسی وجہ سے جلدی چھٹی ہوئی تو مقدس نے اس کا بازو پکڑ لیا تھا۔

”پلیز چلو ناں۔۔۔ بس کافی نی کر واپس آ جا جس گے۔۔۔ ابھی تمہارا تانگا بھی دیر سے آئے گا۔“ وہ ہنسیا جاتی تھی۔

”نہیں مقدس۔۔۔ ایسے کیسے کسی نے دیکھ لیا

ماہنامہ پاکیزہ۔ اپریل 2018ء۔ 183



میں تھی..... سرخ اور سیاہ لان کے جوڑے میں سرخی آنکھوں والی وہ لڑکی جانی کو بڑی عزیز تھی۔

”کیوں آئی ہو.....؟“ وہ چاہ کر بھی اپنا لہجہ سخت نہ کر پایا تھا۔

”میں تم سے معافی مانگنے آئی تھی۔“ وہ شرمندہ نظر آنے کی پوری کوشش کر رہی تھی۔

”کس بات کے لیے؟“

”وہ میں نے نیچے تمہیں اتنی باتیں سنا دیں..... سوری..... میں غلط تھی.....“

”میں ناراض نہیں ہوں رخصتی.....“ رخصتی نے ان بولتی لگا ہوں کو دیکھا۔

”تمہیں ناراض ہونا چاہیے جانی.....“ جانی اس کے قریب آیا۔ اور بڑی بے بس سی مسکراہٹ تھی اس کے چہرے پر۔

”محبت کرتا ہوں تم سے..... ناراض ہو ہی نہیں سکتا.....“ رخصتی نے جانی کے کندھوں کے پار نظر آتے آسمان کو دیکھا تھا۔

”تو پھر حیدر اس سے کیوں ناراض ہو گیا تھا.....“

صرف اتنی سی بات پر کہ وہ رات کے اندر چہرے میں اس سے ملنے نہیں آسکتی..... وہ سوچ کر رہ گئی۔

”جانی..... میری ایک بات مانو گے.....؟“ رخصتی منتظر لگا ہوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

”جان چاہیے؟“ وہ شرارت سے پوچھ رہا تھا۔

”نہیں، تمہاری جان نہیں چاہیے.....“ اس نے نفی میں سر ہلا دیا تھا۔

”تو پھر.....؟“ کبوتروں کے بیروں کے پھلے شور کر رہے تھے۔ ہوا میں نمی جانے کہاں سے آئی تھی۔

رخصتی نے ہاتھ کے دباؤ سے اپنی چوڑی توڑ دی تھی۔ کالج کلائی میں کھبا ہوا تھا۔

”تم مجھے اپنے دل سے نکال دو..... مجھ سے محبت کرنا چھوڑ دو..... اتنا کر سکو گے میرے لیے؟“

☆☆☆

کسی کو دل سے نکال دینا اور محبت کرنا اگر ذرا سی بھی آسان بات ہوتی تو اللہ یار کب کا کر چکا ہوتا۔

”فردین علی“ کا نام اسے نیزے کی االی کی طرح چھٹا تھا۔

ہاتھیں سنا دیں اور میرے سامنے ہی تم نے اسے چھ رنگ کبھے تھے۔“ رخصتی تخت پر گر گئی تھی۔ وہ جیسے غائب و مافی کے عالم میں تھی۔

”مجھے لگا..... میں نے چار رنگوں کا کہا تھا۔“ فری دوپٹے اس کی طرف پھٹتی اندر بڑھ گئی۔ رخصتی نے سر اٹھا کر بیڑھوں کی طرف دیکھا تھا جہاں سے وہ ابھی، ابھی اوپر گیا تھا۔

☆☆☆

”وہ دل کی بری نہیں ہے جانی..... بس کبھی، کبھی انسان پریشانی میں کسی اپنے پر ہی غصہ اتار دیتا ہے۔“

اللہ یار ہمیشہ کی طرح اسے سمجھا رہا تھا اور یہ تو خیر اس کی اب ڈیوٹی بن چکی تھی کہ کھر کے ہر فرد سے ان کی پریشانیوں اور مسائل کو سننا اور پھر مشوروں سے نوازنا۔

اب بھی وہ یہی کر رہا تھا۔

”یار..... اللہ یار..... دل کی اور اپنے پن کی باتوں کو تو رہنے ہی دے تو.....“ خار کھاتی ہے وہ مجھ سے..... شکل نہیں دیکھنا چاہتی میری..... میں بھیڑا لگتا ہوں اسے.....“

اللہ یار اس کی پیٹھ پھٹکا ہنس پڑا تھا۔

”جھڑ یار..... تو نے کچھ زیادہ ہی دل پر لے لیا ہے۔“ جانی اس کے ہاتھ پھٹکا چوہارے کی منڈیر کے پاس جا کھڑا ہوا۔ اس کی نظریں شاہی پٹلی کی کاٹھ کپڑ سے اتنی پتھوں پر تھیں کبوتروں کے بیروں کے پھلوں کی آوازیں آ رہی تھیں..... آسمان دو، تین پتھوں سے سجا لگتا تھا۔

”تیرے لیے یہ سب کہنا بہت ہی آسان ہے اللہ یار..... بہت آسان.....“ وہ پھر تھا اللہ یار سمجھ گیا تھا۔

”وہ کیسے؟“ اس نے اپنے لہجے میں ہلا کی بنیاد کی مہر لی۔ جانی نے پتنگ کو پھڑ پھڑا کر زمین کی طرف آتے دیکھا تھا۔

”کیونکہ تو نے محبت نہیں کی..... جس دن کر کے مجھے گناہ تو جب سمجھ گا.....“ کاش وہ اس وقت مڑ کر ایک نظر اللہ یار کو دیکھ لیتا..... تو وہ سارے سوال بھول جاتا۔

”تو وہ رنگ خاموشی رہی..... پھر چوڑیوں کے کھٹکنے کی دواز آئی تھی۔“ جانی نے اب مزے دیکھا..... اللہ یار کی کہ اب وہاں رخصتی کھڑی تھی..... وہ سخت الجھن

میں..... اور فردین علی کا نام دروازے میں کڑے اللہ یار کو کسی پتھر سے نہیں لگا تھا..... اندر کہیں نہیں آگئی تھی..... وہ سال گزر جانے کے بعد بھی اسے وہ روشنی کی دریاں لڑکی یاد تھی بھلا اللہ یار کیسے بھلا دیتا..... اسے تو پہلی نظر میں محبت ہوتی تھی..... مگر آج کیجیے پرچھو پڑی تھی۔

☆☆☆

”تم ہی بات کرو اس سے..... جانے کیوں کھوئی، کھوئی سی رہنے لگی ہے، کھانے پینے میں بے پروائی دکھا رہی ہے..... تم تو دوست ہو نا اس کے وہ تمہاری تو ہر بات سن لیتی ہے.....“ بانو روٹی تیل رہی تھیں اور وہ ساتھ اسٹول پر بیٹھا تھا دل چاہا ان سے کہہ دے۔

”اب وہ اللہ یار کی نہیں سنتی، اپنے دل کی سنتی ہے.....“ بانو نے روٹی سیکے اسے مخاطب کیا تھا.....

”کمرہ دسگے ناں اس سے بات..... شاید امتحانوں کی وجہ سے پریشان ہے۔“ وہ ادا سی ہے۔

”محبت امتحانوں کے دنوں میں ہوتو بڑا فائدہ دیتی ہے۔“ وہ اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

”آپ فکر مت کریں، میں اس سے بات کروں گا۔“ وہ میرا دے میں آیا تو کجک چھڑی ہوئی تھی۔

رخصتی، جانی پر بکڑی ہوئی تھی۔

”وہ بیان کہاں ہوتا ہے؟ میں نے دوپٹے ڈال کر دل کو دیے تھے..... اگر دل نہیں تھا تو منہ کر دیتے..... میں نے چار رنگ کبھے تھے چوڑی..... وہ سخت غصے میں تھی..... دوپٹے اس نے تخت کی طرف اچھال دیے تھے..... جانی نے ضبط کے عالم میں رخصتی کو دیکھا۔

”تم نے چھ رنگ ہی کبھے تھے رخصتی.....“ اس کا چہرہ غصے سے سرخ ہوا تھا۔

”مجھے اچھی طرح علم ہے کہ میں نے کیا کہا تھا..... تمہیں کوئی کام کہہ دو تو موت آنے لگتی ہے۔ بس روٹیاں تڑوا لو ان سے.....“ وہ دھکی چہرے کے ساتھ رخصتی کو دیکھتا رہا تھا..... اس نے اس کے پیچھے پر ہاتھ ڈالا تھا۔ وہ چپ چاپ محبت کی طرف جاتی بیڑھیاں چڑھ گیا تھا..... اللہ یار بھی اس کے پیچھے چلا گیا تھا..... فری نے تخت سے دوپٹے اٹھائے اور تن کرتی رخصتی کی طرف آئی۔

”دماغ درست ہے تمہارا.....؟ تم نے جانی کو اتنی

تو؟“ وہ ڈر رہی تھی..... مقدس نے ناراضی دکھائی تو وہ آمادہ ہو گئی..... فردین نے بیک دیویر اس پر سیٹ کر دیا تھا۔ ان دونوں کی آنکھیں چار ہوئی تھیں..... رابو کی ہتھیلیاں بیگم گئی تھیں..... پرنسوم کی خوشبو مدھوش کن تھی..... مقدس ہیفون لگائے ٹیکسرا کی طرف متوجہ تھی۔

فردین علی نے پلکوں کی چلن کو اٹھتے مگرتے دیکھا تھا اور دلکش انداز میں مسکرایا تھا۔ ”آنکھوں کی گستاخیاں معاف ہوں۔“ کافی شاپ کے ماحول نے رابو کو حیرت زدہ کر دیا تھا..... وہ بالکل ٹی وی ڈراموں کے جیسی جگہ تھی..... روشنیاں دھجوں کی طرح دیواروں پر بکھری ہوئی تھیں..... رنگوں کا لک جہاں تھا..... میوزک کا خوب صورت سا شور تھا..... مقدس آگئی تھی۔

”میکسکو ڈی..... میں واٹس روم سے ہو کر آتی ہوں۔“ وہ چلتی گئی تو فردین، رابو کی طرف جھکا۔

”آپ کو کسی نے بتایا ہے کہ آپ کتنی خوب صورت ہیں؟“ رابو کی جان پھٹل پر آئی تھی۔

”آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں؟“ تھوڑا دور ہوا اور بھاپ اڑاتی کافی کا کپ اٹھا لیا تھا۔

”خوب صورتی مجھے متاثر کرتی ہے اور آپ بہت خوب صورت ہیں۔“ شاہی پٹلی کی وہ سادہ سی لڑکی گفتگوں کے جھل میں جھٹکتی چلی گئی تھی..... اس بات سے بے خبر کہ راستے تو ہزار ہوتے ہیں مگر منزل ایک ہوتی ہے..... رابو نے دل کو بڑا ڈپٹا تھا..... کچھ دنوں بعد جب رخصتی مسکارا لگانے کی تیاری میں تھی تو رابو اس کے پاس آن کھڑی ہوئی تھی۔

”واقعی..... رخصتی جب مرد، عورت کو قتل پھر کہہ رہا ہوتا ہے تو واقعی اس سے محبت کر رہا ہوتا ہے۔“ رخصتی کے ہاتھ سے مسکارا پھوٹ گیا تھا۔ اس نے رابو کو جھنجھوڑا۔

”تمہیں یہ بات کسی نے کہی ہے رابو.....؟“ رابو کے سینے سے دل غائب ہو چکا تھا۔

”ہاں رخصتی..... کہا ہے کسی نے۔“

رخصتی نے اسے اپنے پاس بٹھا لیا تھا۔

”کس نے کہا ہے رابو؟“ رابو نے وحشت کے عالم میں اپنی ہچکلی پٹلیں اٹھائی تھیں۔

”فردین علی نے.....“ کچھ نام پتھر کی طرح لگتے

ماہنامہ پاکیزہ۔ اپریل 2018ء 184



### بد نصیبی

باوردی محافظ نے بادشاہ کو آکر بتایا۔

”شہر بھر میں زہریلا دھواں پھیل رہا ہے۔

وجہ معلوم نہیں ہو سکی۔۔۔۔۔ اور نہ ہی اس کا سد باب

ممکن نظر آتا ہے۔ اگر یہی حالت رہی تو لوگ جی،

بیچ کر آسمان سر پر اٹھالیں گے۔“ بادشاہ یہ سن کر

پریشان ہو گیا۔

چند لمحے بالکل خاموش رہنے کے بعد بولا۔

”عوام کو میری طرف سے حوصلے سے کام

لینے اور پرمعزز رہنے اور اپنی مدد آپ کے تحت

پریشانیوں سے مقابلہ کرنے کا بیغام بچھو دو اور محل

کی کھڑکیاں دروازے اچھی طرح بند کروا کے

گراموفون کی آواز بڑھا دو۔۔۔۔۔“

از: ناظمہ اعوان، واہ کینٹ

مشراب ناپسند ہونے کے باوجود بھی وہ لبوں سے لگا لیتی۔

مدم میوزک اور روشن رنگوں کے جلو میں وہ گھنٹوں باتیں

کرتے رہتے۔ وہ بہت خوش تھی۔۔۔۔۔ فردین علی کی محبت

نے جیسے اسے آسمان پر پہنچا دیا تھا۔ وہ کھوئی، کھوئی سی

رہنے لگی تھی۔۔۔۔۔ امتحانات سر پر تھے مگر اس کی بے پروائی

عروج پر تھی۔۔۔۔۔ اور انہی بے پروا سے دنوں میں اللہ یار

اس کے سامنے سوال جواب کا دفتر کھولے کھڑا تھا۔

”تم نے اتنی خاموشی سے محبت کر لی اور بتایا بھی

نہیں۔“ راہو کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے تھے اس نے

گردن جھکا کر ادھر ادھر دیکھا تھا۔

”منہ پھاڑ کر کیسے تم سے کہہ دیتی کہ میں نے محبت

کر لی۔ میں ایک مشرقی لڑکی ہوں اللہ یار۔۔۔۔۔“ اللہ یار

نے اداسی سے مرجانے والی حالت میں اپنے سامنے

کھڑی اس لڑکی کو دیکھا۔

”لو کہ بھی منہ پھاڑ کے یہ بات نہیں کہہ دیتے

راہو۔۔۔۔۔“ انگلیش کی کتاب راہو نے میز پر رکھی تھی۔

”تمہیں بھی تو کہیں نہیں ہو گئی؟“ وہ کتابوں والی

الماری صاف کر رہی تھی۔۔۔۔۔ ہلکی، ہلکی دھول اٹھنے لگی تھی۔

کے وقت اللہ یار کی پیشانی چوٹی پر تھی اور راز کی بات چپکے

سے کہہ دی تھی۔

”جس نے تو بہت محبت کرے گا ناں وہ تجھ سے

عشق کرے گی اللہ یار۔۔۔۔۔“

☆☆☆

”تمہارے ہاتھوں میں ہندی بڑی پیاری لگتی

ہے۔“ فردین نے اس کے دونوں ہاتھ تھام لیے تھے۔

وہ شرم سے لپکتی تھی۔

”وہ چھپو کی شادی پر لگائی تھی۔“ وہ دونوں کافی

شاپ میں بیٹھے تھے، آج مقدس نہیں آتی تھی۔

”تم لڑکیاں اتنا شرماتی کیوں ہو یار۔۔۔۔۔“ وہ اور

سرخ پڑ گئی۔۔۔۔۔ ”آج کل ایسی معصومیت، ایسا بائگین

نایاب ہو چکا ہے۔ کہاں نظر آتا ہے۔۔۔۔۔“ راہو اس کے

پرفیوم کی مہک سے ٹھٹھاں ہوئی جا رہی تھی، وہ ساحر

تھا۔۔۔۔۔ سحر بھونکتا تھا۔

”تم مجھ سے بہت محبت کرتے ہو ناں؟“ وہ ہر

ملاقات میں یہ سوال ضرور پوچھتی۔

”کوئی شک ہے تمہیں؟“ وہ سیدھا اس کی آنکھوں

میں دیکھتا۔

”نہیں، نہیں آپ پر تو راہو خود سے بھی زیادہ

یقین ہے۔“

”تمہارا یقین سلامت رہے گا۔“ کافی کی بھاپ

کے پار بیٹھا وہ یقین دلاتا اور وہ ہمیشہ کی طرح یقین

کر لیتی۔

”میں یہ گفٹ نہیں لے سکتی کسی کو بتا چل گیا تو۔۔۔۔۔“

اس نے خوفزدہ ہو کر گفٹ لینے سے انکار کر دیا تھا۔

”بہت ڈرتی ہو مگر والوں سے؟“ وہ سرد لگا ہوں

سے اسے دیکھنے لگا۔

”ہر لڑکی ڈرتی ہے۔“ اس کی بات پر وہ تہہ لگا کر ہنسا۔

”ہر لڑکی نہیں ڈرتی اور ڈر پوک لڑکیوں کو محبت نہیں

کرنی چاہیے۔“ اس نے خوف سے اس کے قہقہہ لگاتے

چہرے کو دیکھا تھا۔

”کیا مطلب؟“ وہ کافی کے گھونٹ لیتا۔

”ارے فراق تھا یار۔۔۔۔۔ تم تو بات، بات پر سیریس

ہو جاتی ہو۔۔۔۔۔ تم کافی پیو ناں۔۔۔۔۔“ کافی جیسا کڑوا

ماہنامہ پاکیزہ۔ اپریل 2018ء

سارے جہان کے جتنو اللہ یار نے اپنی آنکھوں

میں بھر لیے تھے۔

”زندگی سے۔۔۔۔۔ لوگوں سے۔۔۔۔۔ وقت اور

حالات سے بھی۔“ وہ املی کھاتی، آنکھیں میچ لیت تھی۔

”کاش۔۔۔۔۔ میں بھی زندگی سے کچھ سیکھ جاتی۔“ یہ

اس کا بہت بڑا صدمہ تھا۔

”فکر نہ کرو۔ وقت آنے پر سیکھ جاؤ گی۔“ وہ

ہاتھ جھاڑتی اٹھ کھڑی ہوتی۔

”جانے وہ وقت کب آئے گا۔۔۔۔۔ اللہ یار۔۔۔۔۔“ وہ

جانے کب سے اس وقت کی منتظر تھی کہ جب وہ بھی اللہ

یار کی طرح سمجھداری کی باتیں سیکھ جائے گی جن باتوں

کے لیے سارا گھر اس کا دیوانہ تھا۔۔۔۔۔ ماجدہ صدیقی

کیفیت میں اللہ یار کے پاس آتی تھیں۔

”تم نے رضیہ بٹ کا ہانو پڑھا۔۔۔۔۔؟“ وہ شرمندگی

سے سر ہلاتا اب کیا کہنا، راہو کی وجہ سے اگا تھا کرکشی کو

پڑھ رہا تھا۔

”جلد پڑھ ڈالو یار۔۔۔۔۔ پھر پاؤ پڑھا کر کھائیں گے

اور تھرے کریں گے۔“ وہ جیسے سب کا راز دار بن گیا

تھا۔۔۔۔۔ ماجدہ نے بہار کے دنوں میں اللہ یار سے کیا

سوال کر ڈالا تھا۔

”جب کوئی آپ کو کہے کہ وہ آپ سے محبت کرتا

ہے اور آپ کو زندگی میں شامل کرنا چاہتا ہے تو کیا کرنا

چاہیے؟“ اور اس وقت اللہ یار نے ان کی آنکھوں میں

قتاروں میں دیکھ جلتے دیکھے تھے اور وہ ان

آنکھوں میں اندھیرا نہیں دیکھ سکتا تھا۔

”محبت کو انکار نہیں کرتے۔۔۔۔۔“ اور ماجدہ نے بھی

اپنے راز دار کی بات سے انکار نہیں کیا تھا۔۔۔۔۔ وادی اماں

تو جسے سے لال ہو گئیں۔

”ارے رٹو بے سے کیسے بیاہ دوں تجھے؟“

ماجدہ بڑی حقیقت پسند تھیں۔ سر سے دھڑاتا کر اماں

کے پیروں میں ڈال دیا اور نکتے مرتن کر کھڑی ہو گئیں۔

”تمہاری سفید چوڑے والی بیٹی کو بیاہنے دور

دیس سے اب کوئی شہزادہ نہیں آئے گا اماں۔۔۔۔۔“ اس دن

ماجدہ نے اپنا کیس خود چپکے سے لڑا تھا اور جیت بھی

گئیں۔۔۔۔۔ لال جوڑے میں دہن بنی ماجدہ نے رخصتی

اسے وہ دن یاد آ رہے تھے جب وہ پہلے پہل یہاں

آیا تھا سب کچھ کتنا اجنبی سا تھا۔۔۔۔۔ اسے بہت وقت لگا تھا

ان سب سے قریب ہونے میں، جب سے آج تک وہ

وادی کو حقیقتاً تازہ کر کے دے رہا تھا۔۔۔۔۔ بانو کے ساتھ بچن

میں کام کر دیتا تھا۔۔۔۔۔ ساجدہ اور ماجدہ کے اسٹوڈنٹس کی

مارکس شیٹ بنوانے میں مدد کرتا۔۔۔۔۔ چاب کے لیے

سرگرداں جاجی کی ہمت بڑھاتا، اجمل اور اکمل کے سر کی

مالش کر دیتا۔۔۔۔۔ دپاکے دنوں میں اسلم چچا کے کیڑوں کی

حفاظت کیا کرتا۔۔۔۔۔ بارشوں میں چھتیں چھتی تھیں تو وہ

جاجی کے ساتھ مل کر پانی لگاتا۔۔۔۔۔ اور ان سب کے بعد

وہ تھی۔۔۔۔۔ جس کے ہونے سے اللہ یار کو وہ گھر بہت پسند

تھا۔ اس کا معاملہ تو سب سے الگ اور جدا تھا۔۔۔۔۔ بڑی

تک چڑھتی تھی مگر رام ہوئی گئی۔۔۔۔۔ اخروٹ جیسی تھی۔

چھوٹی، چھوٹی باتوں پر ابراجھتی رہتی۔

”یہ ڈسکو ہر وقت نصیبو لال کیوں سنتا ہے؟“ وہ

اپنی مسکراہٹ دہاتا تھا۔

”تو بیچارہ پھر کیا سنتے؟“

”ڈسکو اسٹوڈیو۔۔۔۔۔“

”یہ سب اتنا اونچا کیوں بولتے ہیں؟“

”یہ سارے بوڑھے لوگ اپنی موجودگی کا احساس

دلانا چاہتے ہیں۔“

”مگر ایسے کیسے؟“

”بڑھاپے کی آوازوں پر لوگ کان نہیں دھرتے

ناں اسی لیے۔۔۔۔۔“

”اور یہ جھوٹے بیچے پورے کپڑے کیوں

نہیں پہنتے؟“

”انہیں گرمی لگتی ہے راہو۔۔۔۔۔“

”ماجدہ اور ساجدہ بچپو ہر وقت کی جھگڑتی ہیں؟“

”وہ زندہ ہیں اور زندہ لوگوں کو بھگڑنے کرنے چاہئیں۔“

”اماں کو بہت شوق ہے سب کی جی حضوری کا۔۔۔۔۔“

ہونہ۔۔۔۔۔“

”جی حضوری یاں کبھی شوق نہیں ہوتیں راہو۔۔۔۔۔ یہ

کبھی مروت ہوتی ہیں اور کبھی مجبوری۔“ اور راہو کا دل

چاہتا وہ حیرت سے مرجائے۔

”تم نے ایسی باتیں کہاں سے سیکیں اللہ یار۔۔۔۔۔؟“

ماہنامہ پاکیزہ۔ اپریل 2018ء



”ہوگئی ہے۔“ ”راہو کم از کم اس جواب کی توقع اس سے نہیں کر سکتی تھی۔“

”کس سے ہوگئی؟ کسی دوست کی بہن سے یا جہاں بیٹوں بڑھنے جاتے ہو وہاں کسی سے یا پھر شاہی محلے کی کسی لڑکی سے۔ بتاؤ، بتاؤ۔“ ”اللہ یا رمیز پر چڑھ کر بیٹھ گیا تھا۔“

”بتا دوں؟“ ”وہ اب نکلیوں کے غلاف اتار رہی تھی۔ محلّی کھڑکی سے دادی کے بولنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ وہ کل اللہ یار کی طرف متوجہ تھی جواب اپنا ناخن چا رہا تھا۔“

”ہاں بھئی۔ بتا بھی دو۔۔۔“

”تم سے۔۔۔“ اور مسلسل حرکت کرتے راہو کے ہاتھ جھکے سے رکے تھے۔ وہ کچھ دیر کچھ کہنے کے قابل نہیں رہی تھی پھر اسے سخت غصہ آیا تھا۔

”میں تمہارا منہ تو ڈونڈوں گی۔“ وہ میز سے اتر۔۔۔ قدم، قدم چلا اس تک ایک۔

”تم نے واقعی کچھ سمجھ لیا۔ بھلا تم سے اور محبت میں ابھی اتنا پاگل نہیں ہوا ہوں۔ کسی سلی کی ہانپک جیسی سے محبت کروں گا میں تو۔۔۔“ یہ کہہ کر وہ دروازہ پار کر گیا تھا۔ مگر وہ ایک بات اچھی طرح جانتی تھی اللہ یا راہیے مذاق کبھی نہیں کیا کرتا تھا۔

”اگر یہ سچ ہوا تو۔۔۔؟“ ”وہ سب سوچیں جھک کر اپنے کام کی طرف متوجہ ہوگئی۔ اسی دن اس کے گھر مقدس آگئی تھی۔ وہ شاندار شخصیت کی مالک لڑکی کافی خفا، خفا سی لگ رہی تھی۔ اس نے اپنی گاڑی محلے سے کافی دور کرائی تھی۔ وہ یہ مشکل جگہاں ٹاپ کر اس سلیٹن زدہ غلام گردشوں والی عمارت تک پہنچ گئی تھی جو راہو کا گھر تھا۔ عقید اور فضیلہ مڑ چمیل رہی تھیں۔ صحن میں کھڑے اوڑھے پھر رہے تھے۔ راہو نے اسے صحن میں کھڑے دیکھا تو خوشی سے چیخ ماری کر اس کی طرف دوڑی تھی۔

”ارے مقدس تم یہاں؟“ ”مقدس زبردستی مسکرائی تھی۔“

”دیکھ لو، انسان کو دودھ کے لیے، کیا کچھ نہیں کرنا پڑتا۔“ ”سب سے مل کر راہو اسے اندر لے آئی تھی۔“

جدید تراش خراش کے لباس میں، لہیر دھیں کئے بالوں والی مقدس نے چارپائی پر بیٹھے بڑی بے چینی محسوس کی تھی۔

”اُف۔۔۔۔۔ تم یہاں رہتی ہو۔۔۔۔۔ اس دڑبے میں، میرا تو دم گھٹ رہا ہے۔“ ”رختی اور فری میک اب کا سامان کھولے بیٹھی تھیں۔ مقدس نے آئی شیڈ انگلی کی ٹوک پر چپک کیا تھا۔

”یہ تو بہت گھٹیا قسم کا ہے۔ اس سے تو اسکن الر جی ہو جاتی ہے۔ میرا میک اب تو فرانس سے آتا ہے۔ بہت اچھی کوالٹی ہوتی ہے۔“ ”رختی اور فری نے چپ چاپ سامان سینٹا شروع کر دیا۔

”اور سناؤ کسی گز رہی ہے۔“ اتنے میں بانو ٹرے اٹھائے اندر آئی تھیں ٹرے میں سوسے، پکڑے اور میٹھی نکلیاں رکھی تھیں۔ مقدس نے اپنے سامنے رکھی چیزوں کو دیکھا۔ اور بانو سے مخاطب ہوئی۔

”آئی۔۔۔۔۔ اتنی آگلی چیزیں میں نہیں کھاتی۔“

بانو شرمندہ ہو نکلی انہوں نے جاتی کو بیچ کر ڈسکو سے خاص تاکید کے ساتھ سب کچھ تازہ بخولیا تھا انہیں عجیب سے تازگی نے گھیر لیا تھا۔ راہو نے چائے کا کپ اس کی طرف بڑھا لیا تھا۔

”اچھا، چائے تو تولتاں۔“ ”بادل نا خواستہ مقدس نے چائے کا کپ قلم لیا تھا۔

”اور تمہاری وہ بچپو کہاں ہیں جو رضیہ بٹ کے ناول پڑھتی ہیں؟“ ”وہ طنز تھا۔

”وہ اسکول گئی ہیں۔“ راہو نے مسکراتے کی ناکام کوشش کی تھی۔ مقدس چائے کا کپ رکھ کر اٹھ کھڑی ہوئی تھی اور ہینڈ بیک سے دعوت نامہ نکال کر اس نے راہو کی طرف بڑھا لیا تھا۔

”یہ کیا ہے؟“ ”مقدس کے متوتیں جیسے دانت بج اٹھے تھے۔

”میری انجنت ہے اس پیر کو۔۔۔۔۔ اگر تم آؤ گی تو مجھے خوشی ہوگی۔“ راہو حیران ہوئی تھی۔

”اتنی اچانک کیسے۔۔۔۔۔؟“ ”مقدس گھر کے دروازے کے باہر قدم رکھ رہی تھی۔

”فردین باز انجیکشن کے لیے اٹلی جا رہا ہے تو سب نے سوچا انجیکشن کا فکشن رکھ لیا جائے۔“ ”میل کی ٹوک پر گئی میں غیر متوازن قدم رکھ کر آگے بڑھی مقدس، راہو عرف راہو کی جان نکال کر لے گئی تھی۔

بانو نے ٹرے اٹھاتے ہوئے راہو کو مخاطب کیا تھا۔

”دوست ہمیشہ برابری کے ہی اچھے لگتے ہیں۔۔۔۔۔

جن سے انسان کا قد اور سوجیل میل کھاتی ہو۔۔۔۔۔ ورنہ وہ کے سوا کچھ نہیں ملتا میری بیٹی۔“

راہو کی آنکھ سے کھارے پانی کا قطرہ چھوٹ کر فرش پر گر رہا تھا۔ معمول کے مطابق سلیٹن زدہ دیواروں پر چڑیاں قطار میں بیٹھی راز و نیاز میں مگن تھیں۔ ”اسلم چچا پیالی میں اسپرین محول رہے تھے۔۔۔۔۔ بجورے رنگ کی بلی نکلیں سے آکر مردہ کھڑی راہو کے قدموں میں آ بیٹھی تھی۔

☆☆☆

فردین علی نے اپنے سامنے بیٹھی ٹپ، ٹپ آنسو بہاتی لڑکی کو کوفت کے عالم میں دیکھا تھا۔

”میں نے تمہیں کوئی دھوکا نہیں دیا۔ تمہاری جو توقعات تھیں انہوں نے تمہیں دھوکا دیا۔۔۔۔۔ مجھے جو چیزیں خوب صورت لگتی ہیں متوجہ ہو جاتا ہوں۔۔۔۔۔ تم بھی خوب صورت ہو مگر زندگی میں صرف خوب صورتی تو کام نہیں آتی، کلاس میٹر کرتی ہے، اسٹیشن اپلائی ہوتا ہے۔۔۔۔۔ تم صرف خوب صورت ہو تمہاری کلاس زیر ہے۔۔۔۔۔ بہر حال میرا مقصد تمہیں ہرٹ کرنا نہیں۔“ راہو کو اس مدغم میڈک سے خوف آیا تھا ستم رنگی روشنیاں چمکی بار اندھا کر رہی تھیں۔

”تو پھر وہ سب کیا تھا؟“ اس نے یہ مشکل اپنی سسکی کو روکا۔

”وہ۔۔۔۔۔ ہا۔۔۔۔۔ ہا۔۔۔۔۔ ارے اسے فلرٹ کہتے ہیں۔۔۔۔۔ ہماری کلاس میں ہر لڑکا، ہر چار منگ لڑکی کی طرف متوجہ ہوتا ہے، اس کے ساتھ ڈیٹ پر جاتا ہے۔۔۔۔۔ روٹیں کرتا ہے اور جب دونوں کا دل بھر جاتا ہے تو وہ ایک دوسرے سے الگ ہو جاتے ہیں۔“ ”خوب صورتی کبھی، کبھی لکھی بھیا نک ہو جاتی ہے اس سے پہلے راہو کو ہر گز بھی اندازہ نہیں تھا۔

”مقدس کزن سے میری اور اس میں اتنے کٹنس ہیں کہ وہ میری شریک زندگی ہو۔۔۔۔۔ اور تم میں تو ایسا کچھ بھی نہیں۔“

چپکلے آدھے کھٹنے سے وہ فردین علی کو بولتا سن رہی

تھی اور وہ اسے حیرت ہوئی تھی کراتا سب کچھ ہونے کے باوجود وہ مرکبوں نہیں مٹی۔۔۔۔۔؟ کافی کے کپ پر دم جم چکی تھی۔ وہ سامنے بیٹھے شخص کے لہجے کی شیرینی میں ڈوب کر کافی کی کڑواہٹ اپنے اندر خوشی سے اظہار لیتی تھی۔۔۔۔۔ آج بیرون تلے سے زمین سر کی تھی۔ وہ آج بھی شاہی محلے کی راہو کی، وہ کتنا بھی بدل جاتی وہی رہتی۔۔۔۔۔ اس نے نشو پاکس سے ٹشو کھینچا تھا۔ وہ اب بھی بول رہا تھا۔

”میرے دل میں جو کچھ بھی تھا وہ میں نے کلیئر کر دیا ہے اگر تم چاہو تو اب بھی ہمارا ریلیشن قائم رہ سکتا ہے۔“ راہو نے تھاب درست کیا۔۔۔۔۔ اور بیک اٹھاتی کھڑی ہوئی۔ فردین علی اب بھی بات جاری رکھے ہوئے تھا۔۔۔۔۔ قہری پس میں ملیس ہو کر لباس میں نہایا وہ خوب صورت نظر آتا شخص راہو کو دنیا کے سب مردوں میں سب سے برا لگا تھا۔ فردین علی نے اسے اٹھتے دیکھا تھا اس کی آنکھوں میں اب بھی نہیں تھی۔

”سوری۔۔۔۔۔ مجھے کچھ غلط نہیں ہوئی تھی۔“ آنکھوں کی نمی پر قابو پالنے والی وہ لڑکی اپنی چال کی لڑکھاہٹ پر قابو نہیں پا سکتی تھی۔ فردین علی نے سامنے میز پر دیکھا تھا۔ کافی کے کپ پر دم جم چکی تھی۔ اور شاید اس سے ایک گھونٹ بھی نہیں بھرا گیا تھا۔ اور ساتھ ہی آنسوؤں سے بھیگے ٹشو پیپر بڑا تھا۔ جانے کیوں غیر ارادی طور پر نہ چاہتے ہوئے بھی فردین علی نے وہ ٹشو پیپر اٹھا کر کوٹ کی جیب میں ڈال لیا تھا۔۔۔۔۔ کوئی ”وجہ“ نہیں تھی مگر زندگی میں بہت ساری چیزیں ”بے وجہ“ کرنی پڑتی ہیں جیسے محبت، شاید محبت نہیں ”فلرٹ“۔۔۔۔۔ بڑھنے میں یہ لفظ شاید محبت سے بھی خوب صورت ہے مگر اکثر خوب صورت چیزیں بڑی بد صورت ہوتی ہیں۔ اللہ یا اس رات پڑھ رہا تھا اور روشنی میں دراڑ پڑی تھی۔ رات کے اس پہر وہ دھشت کے عالم میں اس کے سامنے کھڑی تھی۔

”تم اتنی رات کو یہاں کیوں آئی ہو؟“ ”وہ شاید حواسوں میں نہیں تھی یا پھر اللہ یا کوئی اسے لگا تھا۔

”گھر مت کرو۔۔۔۔۔ ابھی چلی جاؤں گی۔۔۔۔۔ میں نے تم سے بس ایک سوال پوچھا ہے۔“ ”اللہ یا ر نے متوقع نظروں سے اسے دیکھا تھا۔۔۔۔۔ سوال والی سوال لے کر



کھڑی تھی اور ایک بات تو طے تھی کہ وہ کبھی سیدھے سوال نہیں کرتی تھی۔

”تمہیں پتا ہے فلٹ کیا ہوتا ہے؟ اور محبت میں دھوکا ملے تو انسان کیا کرے اللہ یار.....؟“ اللہ یار کا دل دھڑکنے لگا ہوا تھا۔ اس بار وہ سب سے مشکل اور آخری سوال نے کراہی تھی۔

”بھائی! اللہ یار.....؟“  
”کیا تم کو پتا ہے؟“ وہ بے بسی کی انتہاؤں پر تھا۔  
”محبت میں دھوکا مل جائے تو کیا کرنا چاہیے؟“  
اس نے پاس پر اپنی کانگلاس غنا غٹ چڑھالیا تھا۔  
”محبت زندگی کا ایک باب ضرور ہوتی ہے مگر پوری کتاب نہیں ہوتی..... زندگی کو اور جوش و جذبے سے خوشی سے گزارنا چاہیے..... محبتیں مل جاتیں ہیں رابو مگر زندگی دوبارہ نہیں ملتی۔“  
”نکے پاؤں کھڑی وہ لڑکی سر ہلاتے ہوئے ہوئے، ہولے چلتی دروازہ پار کر گئی تھی۔ سیکن زدہ کرے میں نئی بڑھ گئی تھی۔ وہ رات اماؤں تھی..... چاند سے خالی..... اس رات کی صبح بہت دیر سے ہوئی تھی..... بہت ہی دیر سے۔“

☆☆☆

شامی محلے پر اس سے پہلے کبھی ایسی بارش نہ بری تھی۔ عین کی چھتوں پر تر تر برتی بارش خوف پیدا کر رہی تھی..... نیم کی مہنیاں درخت سے چھوٹ کر زمین پر آن گری تھیں..... رخنی لڑتی ہوئی دیوار سے لگی کھڑی تھی اور حیدر کا وجود اس کے قریب آ رہا تھا..... بہت ہی قریب..... اسے داؤی یاد آتی تھی.....

”رخنی بیٹی آج پارلمت جاؤ..... موسم کے تیور کچھ ٹھیک نہیں لگ رہے.....“ چھٹیوں کی شوچین فری نے تو مریخ ہاتھ سے جانے نہ دیا تھا۔ رخنی اپری منزل پر اکیلے ہی جانے نذر رہا جی کہاں تھیں..... کھڑکیوں پر بارش کے شور سے وہ چوکی تھی..... بھی وہ اندر آتے حیدر کو دیکھ کر چوکی تھی..... وہ بارش میں مکمل طور پر بیٹھا ہوا تھا..... بھنگی لٹیں پیشانی پر پڑی تھیں..... وہ رخنی کو دیکھ کر خاص انداز میں مسکرایا تھا۔

”ہم تم لڑک کرے میں بند اور چابی کھو جائے.....“  
”حیدر موسم خراب ہو رہا ہے، مجھے جانا ہوگا.....“ چادر ماہنامہ پاکیزہ۔ اپریل 2018ء 190

اور بیک اشفاق وہ گہرا مٹی تھی..... وہ راستے کی دیوار ہو گیا۔  
”اچھی جلدی بھی کیا ہے رخنی..... کچھ اپنی سناؤ اور کچھ ہماری سنو..... یہ موقع بار بار تھوڑی آگے.....“ رخنی کو اس کی چھٹی جس نے خبردار کیا تھا..... وہ آگے بڑھی تھی۔  
”کبھی باتیں کر رہے ہو.....“ یہ وقت ٹھیک نہیں..... میں جارہی ہوں.....“ وہ حیدر کو پرے ہٹاتی دروازے کی طرف بڑھی تھی..... باہر بادل اب بھی گرج رہے تھے..... آوارہ کتوں کے بھونکنے کی آوازیں آ رہی تھیں..... حیدر نے اسے بازو سے پکڑ لیا تھا۔

”ایسے نہیں جانے دوں گا.....“  
”کیا مطلب ہے تمہارا؟“ وہ پسینے میں نہائی تھری، تھرکا پ رہی تھی۔  
”مطلب تم اچھی طرح سمجھتی ہو.....“ رخنی نے خود کو دیوار کی طرف کر لیا تھا۔ جانے کہاں آسانی بنی گئی تھی، لاک مل کو سارے میں روشنی ہی ہو گئی تھی۔  
”تم..... تم تو مجھ سے محبت کرتے ہو ناں.....؟“  
رخنی نے خوف سے لڑکھاتے لہجے میں پوچھا۔  
”صرف محبت سے گزارے نہیں ہوتے..... کچھ اور بھی چاہیے ہوتا ہے.....“

”میں تمہیں ایسا نہیں سمجھتی تھی.....“  
”تو اب سمجھ لو ناں.....“ وہ ہٹاؤ نے انداز میں رخنی کے قریب آیا تھا اور اس کے منہ پر پڑنے والے چھڑ کا شور بادلوں کی گونج میں کہیں گم ہو گیا تھا..... وہ پوری قوت سے دروازے کی طرف بھاگی تھی..... بارش پورے زور شور سے برس رہی تھی..... اس کی چادر اور بیک وہیں رہ گیا تھا۔ بڑھتیوں سے بھاگتے ہوئے وہ دو بار گری گئی، آگے بڑھے کا ناخن اڑھ گیا تھا۔ برسی بارش میں نکلتے سر کے ساتھ شامی محلے کی گلیوں میں رخنی نے اپنے آپ کو بھاگتا پایا تھا..... اس کے قنات میں اس کی محبت تھی..... اسے حیدر کے کہے لفظ یاد آ رہے تھے۔

”تمہیں دیکھتا ہوں تو سارا زمانہ بھول جاتا ہوں۔ تم سے خوب صورت آج تک کسی کو نہیں دیکھا۔“ اور اس نے تختی خوشی سے یقین کر لیا تھا..... ہاں لڑکیاں تو خوشی سے لکڑی ہیں..... وہ تو اسے ”قلو پلہ“ کہتا تھا تو قلو پلہ..... وہ کو دیکھنے کے لیے مصر کے پرانے زمانے کھگانے کی

ضرورت نہیں..... میری قلو پلہ کا تو اسی زمانے میں وجود ہے.....“ اور رخنی کتنا بستی تھی اس بات پر..... اور آج وہی بستی اس کے لیے جیسے صور اسرافیل بن گئی تھی..... شامی محلے کی گلیوں کی دیواریں تھامتی رہے آواز رو رہی تھی..... وہ قلو پلہ نہیں تھی..... وہ وہ بھی نہیں تھی..... عین کی چھتوں پر اہلی بارش کی آواز تھی..... بادل اب بھی گرج رہے تھے..... وہ نکلتے سر کے ساتھ گھر کے دروازے پر کھڑی تھی..... جانے کیسے اسلم بچا ڈبے کو تالا لگانا بھول گئے تھے اور بلایاں سارے کبوتروں کے گلے گھونٹ گئی تھیں..... اسلم بچا چوہارے سے مردہ کبوتر نیچے مچن کی طرف پھینک رہے تھے..... مچن میں مردہ کبوتروں کے لاشوں کی ڈھیریاں لگ گئی تھیں..... نکلتے سر پر ہاتھ رکھے رخنی نے سر اٹھا کر چوہارے سے کبوتر کرتے دیکھے تھے..... اگلے ہی بل دونوں ہاتھ منہ پر رکھے وہ پھوٹ، پھوٹ کر رو رہی تھی..... آج کی بارش بہت بھاری تھی۔ اس محلے کے کیکوں پر..... اسلم جیسے کبوتروں سے زیادہ چڑ رخنی کوئی تھی..... اور آج وہ وہی شتم ہو گئی تھی..... کبوتروں کے ڈھیر کے پاس کھڑی رخنی پر سب سے پہلی نظر رابو کی بڑی تھی..... بارش میں بیٹھی، نکلتے سر اور اڑھتے ہوئے ناخن کے ساتھ روتی ہوئی رخنی، رابو کو اپنے جیسی لگی تھی..... وہ اس کی طرف دوڑی تھی..... رخنی نے ہولے سے سرگوشی کی۔

”ہم دونوں غلط تھیں رابو..... ہم دونوں کوئی محبت راس نہیں آئی.....“ شامی محلے کی وہ دونوں دو شیزائیں مصر کی قلو پلہ انہیں نہیں تھیں..... اللہ یار اور حاجی تھیلوں میں مردہ کبوتروں کے لاشے ڈالے کہیں دور پھینکتے جا رہے تھے..... اور وہ دونوں نہیں جانتے تھے اس غلام گردوشوں والے گھر میں صرف محبت کی موت ہوئی تھی۔ پھر کہیں کبوتروں نے زندگیاں ہاری تھیں..... قلو پلہ کا قصہ تمام ہوا..... اور محبت کا بھی.....

☆☆☆

”تم ترس کھا رہے ہو مجھ پر.....“ رابو کی آواز بھرا گئی تھی..... برسوں گزر گئے پر وہی چوہارہ تھا..... وہی محلہ تھا اور وہی دونوں تھے لیکن بیچ میں جانے کتنے سال آئے تھے۔  
”خود پر ترس کھا رہا ہوں.....“ اللہ یار نے منڈیر سے

دیا

فلک لگائے اسے دیکھا تھا، وہ شوخ و چنچل لڑکی آج سختی برد بار اور سنجیدہ نظر آ رہی تھی..... رابو نے نظر لگ جانے کے ڈر سے اللہ یار کو دوبارہ نہیں دیکھا تھا۔ آری کے یونیفارم میں وہ بہت ہی نچ رہا تھا، شمار لگ رہا تھا۔  
”اماں آج..... ہم دونوں کے رشتے کی بات کرنے آئی ہیں۔“ رابو نے تڑپ کر اسے دیکھا تھا جس کا چہرہ جانے کیوں آج اتنا روشن تھا۔  
”میں انکار کر دوں گی۔“ اس کا لہجہ قطعیت سے۔

بھر پور تھا۔ وہ سیدھا چلتا اس کے سامنے آن کھڑا ہوا تھا خوشبو نے گھیرا ڈال دیا تھا..... وہ بڑی مانوس سی مہک تھی اپنی، اپنی۔  
”میں منہ توڑ دوں گا تمہارا..... اور تم اچھی طرح جانتی ہو کہ میں ایسا کر بھی سکتا ہوں۔“ وہ ڈر کر پیچھے ہٹی تھی۔  
”تم ایسا کیسے کر سکتے ہو اللہ یار..... تم جانتے ہو کہ ماضی میں میری زندگی میں کوئی اور تھا۔“  
”ماضی اور حال میں بڑا فرق ہوتا ہے رابو..... اور یہ باتیں بڑی بات نہیں.....“

”دوستی کی خاطر کر رہے ہو ناں یہ سب۔“ لہجے کی کڑواہٹ اللہ یار کو دل پر محسوس ہو گئی تھی۔  
”تمہیں، محبت کی خاطر کر رہا ہوں۔“ سر پر کپ درست کرتا وہ بیڑھیاں اتر گیا تھا۔ پیچھے وہ کم مسم کھڑی رہ گئی۔ وقت نے سب بڑی تیزی سے بدلا تھا۔ چوہارے کے ڈبے اب کبوتروں سے خالی تھے۔ اسلم بچا نے اس واقعے کے بعد خاموشی سادھ لی تھی۔  
”رابو..... میں نے ان کی موت کا دکھ مرے ہوئے انسان جتنا محسوس کیا ہے، وہ تو بھڑے تھے جب سے ان کی دیکھ بھال کر رہا تھا..... دکھ تو ہوتا ہے ناں، دل تو دکھتا ہے۔“ وہ ٹکلی دے رہی تھی۔

”تو آپ اور کبوتر لے آئے گا۔“ وہ اداسی سے ہنسنے لگی۔  
”میرا بہت چھوٹا سادل ہے اس بار سہہ گیا ہوں مگر اگلی بار مر جاؤں گا۔“ اور پھر ان گزرے سالوں میں رابو نے انہیں کوئی بھی مشورہ نہیں دیا تھا..... شامی محلے کی روٹیں آج بھی ویسی ہی تھیں۔ بڑے میدان میں بسنت کے دنوں میں پتلیں اب بھی اڑاٹی جاتی ہیں، انکیشن کے دنوں میں امیدوار حضرات پوریت والی ماہنامہ پاکیزہ۔ اپریل 2018ء 191



”نہیں اماں..... بالکل بھی نہیں۔“  
 شہد کی مکھوں کا مدھر شور سنا کر دے رہا تھا.....  
 تالے و پکڑیاں پار کر کے کہیں ریلوے اسٹیشن کی دھند  
 میں لپٹی قدم قدم عمارت نظر آتی تھی۔ رابو کو عمارت بڑی  
 پیاری اور مقدس لگی تھی۔ وہ عمارت بڑی شان سے اپنی  
 جگہ پر کھڑی تھی۔ ریل کی دھانی پڑیوں پر کچھ آوارہ  
 کتے ہل رہے تھے۔ چندنگی اور کوٹ پہنے شاہانہ بانگن  
 سے گھوم رہے تھے۔ ایک ریلوے آفیسر افسرانہ تمننت  
 کے ساتھ پلیٹ فارم پر سگار پیتا ہل رہا تھا۔ ریلوے  
 اسٹیشن کی عمارت کے دروازے پر کچھ تھکے آوارہ پھر رہے تھے۔ لکڑی کے بیچوں کی قطاریں  
 مچی ہوئی تھیں۔ وہ اور اماں ایک لکڑی کی بیچ پر بیٹھ گئی  
 تھیں۔ ایک لڑکا چائے کے دوپلے آیا تھا۔ وہ  
 رابو کو دیکھ کر جیسے شرماسا گیا تھا۔  
 ”یہ کیٹن اللہ یار کی دھانی ہیں ناں.....؟“ اس  
 کے جھپٹے ہوئے سوال پر اماں نے مسکراتے ہوئے سر  
 اثبات میں ہلایا تھا۔  
 ”اماں..... اللہ یار کو یہاں سب جانتے ہیں؟“  
 ”ہاں بیٹا..... سارا عملہ جانتا ہے۔“ کچھ مسافر  
 ٹولوں کی صورت میں ادھر ادھر ٹھہر رہے تھے۔ کچھ  
 فرارے مارٹی ٹرین کی سیٹی گونجی تھی اور چٹھاڑیں مارتی  
 گاڑی کا انجن سکون میں آیا تھا۔ بوموں کے دھانی  
 دروازے دھڑ دھڑ کرتے کھلے اور فوجی جوان باہر نکلے  
 تھے۔ رابو کا دل دھڑکنا بھول گیا تھا۔ وہ دیوانگی کے عالم  
 میں اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ بھانت، بھانت کی آوازیں آئی  
 تھیں۔ چار فوجی ایک تابوت کندھوں پر اٹھائے پلیٹ  
 فارم پر اترے تھے۔ لوگوں کا جھوم اٹھا ہو گیا تھا۔ رابو نے  
 وحشت کے عالم میں اماں کو جھنجھوڑا تھا۔  
 ”اماں..... اللہ یار کہاں ہے؟“ لوگوں کے جھوم  
 نے راستہ چھوڑ دیا تھا۔ رابو اور اماں نے ایک دوسرے کو  
 دیکھا تھا۔ فوجی جوان ایک طرف ہاتھ باندھے کھڑے  
 ہو گئے تھے۔ دس قدم سے دوری پر وہ تابوت پڑا تھا۔  
 رابو کا ہاتھ سینے پر پڑا تھا۔ ریلوے اسٹیشن کی اس قدیم  
 عمارت سے اسے خوف آرہا تھا۔ تابوت کے شیشے پر اس کا  
 پہلا آنسو گرنا تھا۔

روٹھے مناتے ہوئے جانے کب اور کیسے اسے اللہ یار  
 سے محبت ہوگی..... وہ حیران رہ گئی تھی..... جب بھی اسے  
 چھٹی آتا ہوتا تھا، وہ خط میں پتا دیتا..... اور ہمیشہ ہی اماں  
 اسٹیشن پر اس کی منتظر ہوتی تھیں اور وہ ہر بار رابو کو کہتا  
 تھا..... ”میری آنکھیں چاہتی ہیں کسی روز ریلوے اسٹیشن  
 پر تمہیں جوا نظر دیکھیں۔“  
 ”اپنی آنکھوں کو ہوا دقت میں رہیں۔“ کیا یوں  
 سے درانتی کی مدد سے گاجریں نکالتی وہ جواب دیتی.....  
 وہ گھٹنوں کے بل اس کے قریب بیٹھ جاتا تھا۔  
 ”جس دن میں نے تمہیں اپنا منتظر پایا ناں سچ کہتا  
 ہوں خوشی کے مارے میرا دل دھڑکنا بھول جائے گا۔“  
 رابو نے ہاتھ میں پکڑی درانتی میں اس کے دل کے مقام  
 پر رکھ دی تھی۔  
 ”کسی روز تمہارے دل کو آذر مکر ضرور دیکھوں گی  
 اللہ یار.....“ اور آج صبح ہی اس نے اماں سے کہا تھا۔  
 ”اماں آج اللہ یار کو لینے میں بھی آپ کے ساتھ  
 اسٹیشن جاؤں گی۔“  
 اس دن رابو نے اللہ یار کے لیے اپنے آپ کو دلہن  
 کی طرح سجا ہوا تھا، وہ اتنی تیار ہوئی تھی اور دل سے  
 ہوئی تھی۔ وہ آئینے کے سامنے کھڑی آنکھوں میں کا جل  
 کی سلاخی پھیر رہی تھی۔  
 ”میری آنکھیں دیکھنا چاہتی ہیں کہ مجھے دیکھ کر  
 تمہارے ہاتھ سے سامان کا بکسا کیسے چھوٹ کر اسٹیشن  
 کے فرش پر گرتا ہے۔“  
 ☆☆☆  
 پندرہ منٹ سے ٹیڑھی میزمری پکڑیاں عبور کرتی  
 وہ دونوں چل رہی تھیں۔ سہ پہر کے تین بجے تھے۔  
 کچھ توں پر سفر دو وہاں دھند سی جاتی ہوئی تھی۔ ہلکی سرد  
 ہوا سے فضا میں خشکی بڑھتی جا رہی تھی۔ کیکر کے درختوں کی  
 ٹہنیوں سے ٹپ ٹپ پانی گر رہا تھا۔ گلاب کے کچھوتوں  
 سے سرخ گلابوں کی مہک آڑ رہی تھی۔ اس نے ایک آدھ  
 کھلی گلی توڑ کر مٹی میں ڈبالی تھی۔ اماں بار بار مڑ کر  
 اسے دیکھتی تھیں۔  
 ”رابو..... تمک تو نہیں تمہیں؟“ اس نے پندرہ  
 منٹ سے ایک ہی جواب دیا تھا۔

رابو نے ساگ بنانا سیکھ لیا تھا۔  
 ”اور دیکھی تھی میں پتا آئے کا حلوا بھی رغبت سے  
 کھاتا ہے۔“ اماں مسکراتی تھیں رابو نے آئے کا حلوا بھی  
 بنایا اور اللہ یار کے سامنے رکھ دیا۔ اللہ یار حیرت سے  
 مرنے کو تھا۔  
 ”یہ تم نے بنایا ہے؟“ رابو نے حیکے چتون سے  
 گھورا تھا۔  
 ”ہاں تو.....“  
 ”میرے لیے.....؟“ رابو کا دل چاہا تھا سر دیوار  
 میں دسے مارے۔  
 ”ہاں.....“  
 ”اماں تیری بوجھ سے محبت کرنے لگی ہے، دیکھی  
 تھی کے لڈو پائٹو.....“ اللہ یار نے باہر کی طرف منہ کر  
 کے ہانک لگا دی تھی۔ وہ غصے سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔  
 ”خوش فہمیاں تو دیکھو حضور.....“ وہ مزے سے  
 حلوا کھا رہا تھا۔  
 ”تو روز بروز پیاری ہوتی جا رہی ہے۔“  
 ”ہونہ نظر مت لگاؤ.....“  
 ”محبوب کی نظر نہیں گتی۔“ وہ باہر نکل گئی تھی۔  
 وہ جب بھی گھر آتا تھا چوٹیں میں سے اٹھارہ گھنٹے  
 اس کے ساتھ لڑتا رہتا تھا۔ اماں اسے ٹوکتی تھیں۔  
 ”کیوں لڑتا ہے اس سے؟“  
 ”اماں، جب تک اس سے لڑائی نہ کروں مزہ نہیں  
 آتا.....“ اور ہر لڑائی کے بعد وہ روٹھ کر اماں کے پاس  
 ہی آتی تھی۔ کبھی رات کے ایک بجے اور کبھی فجر کے چار  
 بجے..... سارا دن دونوں کی بول چال بند رہتی.....  
 ”لڑاؤ کہیں کا۔“ وہ کوہق رہتی تھی۔  
 ”چائے پیتا وہ ٹھنک جاتا تھا۔“  
 ”کیا مجھ سے کچھ کہا۔“ دودھ ہالنا ہوتا تھا اسے۔  
 وہ اس کی طرف سے پیٹھ موڑ لیتی تھی اور وہ بولے سے  
 گنگنا رہتا تھا۔  
 ”ایویں رسیا نہ کر میری جان بچاں..... چمڈ  
 جانٹراں اسی ایسہ جہان بچاں.....“  
 دودھ ابل کر دہنی کے کناروں سے باہر گرنے  
 لگا..... وہ اپنے آپ کو سنبھال لیتی..... لڑتے جھگڑتے،

تقریریں کرنے آتے۔ ڈسکو کا اسٹیر یو اب بھی جگتا.....  
 جاجی کو کھڑکی کی ملازمت مل ہی گئی۔ رشتی اور جاجی کا نکاح  
 ہو گیا تھا۔ اور رشتی شاہی محلے کی سب سے خوب صورت  
 دلہن بنی تھی وہ اب ہنسی سے ماضی پر.....  
 ”بچی رابو..... اللہ یار سچ کہتا تھا محبت زندگی کا  
 ایک باب تو ہو سکتی ہے مگر پوری کتاب نہیں۔“ رشتی نے  
 رابو کے دونوں ہاتھ تھام لیے تھے۔  
 ”پتا ہے رابو..... حسن کی تعریفیں کرنے والے مرد  
 محبت نہیں کرتے۔ حسن کی عزت کرنے والے محبت  
 کرتے ہیں۔ اور اللہ یار سے بڑھ کر میں نے کوئی عزت  
 کرنے والا نہیں دیکھا۔“ رابو کے تصور میں وہ آن انجرا  
 تھا۔ ہلکی بڑھی ہوئی شیو، روشن پیشانی، ستواں ناک اور  
 کسرتی جسم..... وہ نظر انداز کرنے کے قابل نہیں تھا۔  
 رابو نے اداس ہنسی سے رشتی کو دیکھا تھا اور کہا تھا۔  
 ”جا کر کہہ دو اللہ یار سے کہ میں اس سے شادی تو  
 کروں گی مگر محبت نہیں کروں گی۔“  
 ☆☆☆  
 بقول رابو کے اس نے شادی کر لی تھی مگر محبت نہیں  
 کی تھی مگر کبھی، کبھی انسان کو اپنے جذبات کی خبر تک نہیں  
 ہوتی یا پھر وہ انجان بنا پھرتا ہے۔ اسے گاؤں کی زندگی  
 بہت اچھی لگتی تھی اور اماں کیلئے تو اس کی ساس نہیں بلکہ  
 گھوڑی سیٹھی تھیں..... وہ کھلے محن والا لپا ہوا گھر رابو کو  
 زمین پر جتا گیا لگا تھا..... لاتعداد مرغیاں تھیں جو اپنے  
 شریر چوڑوں کو پروں تلے چھپائے پھرتی تھیں۔ اب  
 مرغیاں گنگنا اور ان کے چوڑوں اور انڈوں کا حساب رکھنا  
 رابو کی ذمہ داری تھی۔ اللہ یار بہت کم پھینچوں پر آتا تھا  
 اس کی ملازمت ہی ایسی تھی..... اماں کیلئے اسے اللہ یار  
 کے بچپن سے لڑپن تک کے سارے واقعات سے آگاہ  
 کر چکی تھیں..... انہوں نے ابھی تک اللہ یار کا بستہ اور  
 سلیٹ سنبھال رکھی تھی..... گھر کے سارے کاموں میں وہ  
 اماں کا ہاتھ بٹاتی..... اللہ یار کے خطوط ملتے اور وہ ان کے  
 جواب لکھتی..... اماں اکثر اسے اللہ یار کی پسند سے آگاہ  
 کرتی رہتیں۔  
 ”اسے کھانے میں کیا پسند ہے اماں.....؟“  
 ”سرسوں کا ساگ شوق سے کھاتا ہے۔“ اور  
 ماہنامہ پاکیزہ۔ اپریل 2018ء 192





## میراث ریسل آرزو

”میں توجہ ہے ان کی بات سن رہی تھی۔ ان کی آواز خاصی پات دار تھی۔ اب وہ کہہ رہی تھیں۔“  
”ماں، باپ اور رشتے داروں کے ترکے میں خواہ وہ تھوڑا ہو یا زیادہ لڑکوں کا حصہ ہے اور ماں باپ اور رشتے داروں کے ترکے میں خواہ وہ تھوڑا ہو یا زیادہ لڑکیوں کا بھی حصہ ہے اور یہ حصے خدا کی طرف سے مقرر کردہ ہیں۔“

سورۃ نسا کی آیت نمبر سات کا ترجمہ رومیہ بھابی نے پڑھ کر سنایا تو مجھے بے ساختہ غیرہ آیا یاد آئیں اور میری آنکھ بھر آئی دل سے آہ نکلی۔ ”کاش بھابی آپ کو یہ ارشاد رہانی اس وقت بھی یاد ہوتا جب آپا بائل کے در پر بہت مان سے آئی تھیں اور انہیں تھی

رکھا۔۔۔۔۔“ جابر کو اللہ یار کی کہی بات یاد آئی تھی۔  
”جس دن اس نے کہہ دیا کہ وہ محبت نہیں کرتی تو وہ سچ میں محبت نہیں کرے گی۔۔۔۔۔ وہ عشق کرے گی۔“  
چاروں طرف گرتی دھند میں اماں کو ساتھ لپٹائے وہ لڑکھڑائی ہوئی جاری تھی۔۔۔۔۔ تابوت کے شیشے پر اب بھی وہ ادھ کھلا گلاب تر دنازہ پڑا تھا۔

☆☆☆

قبرستان کے کاسنی پھول ہوا سے اڑتے پھر رہے تھے۔۔۔۔۔ وہ دونوں ہاتھ دعا کو اٹھائے کھڑی تھی۔۔۔۔۔ پھر ہولے سے ہنس دی تھی۔

”راہو کا ظرف اتنا چھوٹا نہیں تھا کہ اللہ یار سے محبت کر لیتی۔۔۔۔۔ تم نے زندگی کا صرف ایک باب مانگا تھا۔ مگر میں نے پوری کتاب تمہارے حوالے کر دی۔۔۔۔۔ تم سے عشق کر لیا۔“

فلک یار اپنی جھولی میں ڈھیروں کاسنی، نارنجی پھول جمع کرتا پھر رہا تھا۔۔۔۔۔ راہو نے اسے آواز لگائی تھی۔

”اُدھر آؤ بیٹا فلک یار۔۔۔۔۔ بابا سے بات کرو۔۔۔۔۔“  
وہ چھوٹے، چھوٹے قدم اٹھاتا شہید کپٹن اللہ یار کی قبر کی طرف آیا تھا اور جھولی میں بھرے سارے پھول قبر پر پھیلا دیے تھے۔۔۔۔۔ راہو اداسی سے مگرادی تھی۔

”تم نے جانے میں بہت جلدی کی اللہ یار۔۔۔۔۔“  
ورنہ میں تمہیں خوشخبری سنانے ہی تو آئی تھی۔ مگر تم تو وعدے کے کپکپکے۔۔۔۔۔ بڑی ناک والے تھے ناں

کہاں، کہاں کب، کب نہیں یاد آؤ گے۔“ وہ آنسو پونچھ رہی تھی۔ فلک یار ساتھ، ساتھ چل رہا تھا۔

”امی۔۔۔۔۔ آپ رورہی ہیں؟“ وہ مگر مند ہوا تھا۔

”ہاں بیٹا۔۔۔۔۔ وہ جیسے خفا ہوا تھا۔

”آپ بالکل بھی بہادر نہیں ہیں۔“

”میرا بیٹا جو بہادر ہے۔ جلدی چلو۔۔۔۔۔ وادی منتظر ہوں گی۔“ وہ دونوں چھوٹے، چھوٹے قدم اٹھاتے قبرستان کے احاطے سے باہر جارہے تھے اور ہمیشہ کی طرح راہو نے پیچھے پلٹ کر ضرور دیکھا تھا۔

آج بھی کپٹن اللہ یار کی قبر پر وہ ادھ کھلا لال گلاب تر دنازہ پڑا تھا۔

”ایک خطرناک آپریشن میں اللہ یار نے جان کی بازی ہاری۔۔۔۔۔“ اماں اونٹھے منہ فرش پر گری تھیں۔  
راہو کے ہاتھ میں پسینے سے نہایا وہ ادھ کھلا گلاب تابوت کے شیشے پر گرا تھا۔

یہ بازی عشق کی بازی ہے جو چاہو لوگا دوڑ کر کیا جیت گئے تو کیا کہنے ہارے بھی تو بازی مات نہیں تابوت میں لیٹا اللہ یار جیسے مسکایا تھا۔ ”جان دینے کی بات ہوئی تھی دیکھ لو۔۔۔۔۔ دے دی جان۔ کیا کہتی ہو؟“ اس نے تابوت کے شیشے پر ہاتھ پھیرا تھا اور تپ، تپ کر روئی تھی۔

”اللہ یار۔۔۔۔۔ میں جاہ کر بھی تم سے محبت نہیں کر پائی۔۔۔۔۔ میں نے تم سے عشق کر لیا۔“ ریلوے اسٹیشن پر گھڑے ہر شخص کی آنکھیں بھر آئی تھیں۔۔۔۔۔ راہو کی ہتھیلیوں کی مہندی کے رنگ کپکپکے پڑ گئے تھے۔ وہ تابوت کی طرف ٹٹکی بانٹھے دھکتی شیشے پر ہولے، ہولے دستک دے رہی تھی۔۔۔۔۔ اسے لگا وہ ابھی ہنستا ہوا اٹھ بیٹھے گا۔

”ہر شام دل کی جگہ ہاتھ رکھ کر تسلی کر لیا کرو۔ کیا پتا کسی دن اپنی جگہ سے ٹھسک جائے اور تم گلیوں، کوچوں میں ڈھونڈتی پھرو۔۔۔۔۔ خیر۔۔۔۔۔ ملنا تو وہاں بھی نہیں اگر کہیں دھڑک رہا ہوگا تو وہ اللہ یار کا سیر ہوگا۔ تمہارا دل میرے سینے میں دھڑکے گا راہو۔“

”میں اس بات کا گواہ ہوں کہ اس نے آپ کے لیے برف کا چار کھڑکیوں والا گھر بنایا تھا۔“ کپٹن جابر نے راہو کی طرف دیکھا اور ہولے سے کہا تھا۔ ”جہاں وہ گیا ہے وہاں کھڑکیاں نہیں ہوں گی۔“ وہ وحشت بھرے انداز میں لپکی تھی۔

اماں نے اٹھ کر راہو کا ہاتھ تھاما تھا۔۔۔۔۔ ”آخری ملاقات میں کہہ کر گیا تھا میری شہادت پر دونوں مت روئے گا ورنہ دوبارہ جی اٹھوں گا۔“ وہ لڑکھڑائی تھی۔ اماں نے تمام لیا تھا۔۔۔۔۔ راہو اماں کا ہاتھ پکڑے، پکڑے کیپٹن جابر تک آئی تھی۔

”بہت اچھے گواہ ہیں ناں آپ۔۔۔۔۔ تو جب مجھ سے سوال اٹھے تو کہہ دیجیے گا راہو نے اللہ یار کو محبت کے لائق نہیں سمجھا، اس نے تو اللہ یار کو عشق کے درجے پر

ماہنامہ پاکیزہ۔ اپریل 2018ء 194